جلیل قدوائی

تذکرے
اور
تبصرے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

تذکرے اور تبصرے

جلیل قدوائی

(ایم۔ اے)

اردو اکیڈمی سندھ

بندر روڈ۔ کراچی

پہلا ایڈیشن : ۱۹۵۹ء

مطبوعہ: ایجوکیشنل پریس کراچی

تعداد: ایک ہزار

قیمت

دو روپے چار آنے

پنجاب آفس: اردو مرکز
گنپت روڈ۔ لاہور

مُندرجات

آل احمد سرور

کے نام

جن کی شگفتہ تنقید کا اردو "ادبِ عالیہ" میں جواب نہیں !

حرفِ آغاز

"تذکرے اور تبصرے" کو میرے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعہ "تنقیدیں اور خاکے" کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہئیے۔ اس مجموعہ میں شامل شدہ مضامین بھی ایک کے سوا سب اب سے بیس پچیس برس قبل شائع ہوئے تھے اور کم و بیش اسی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ کتابی صورت میں یکجا کرتے وقت ان پر نظرِ ثانی کی گئی ہے مگر کہیں کہیں عبارت بدلنے یا بعض غیر ضروری حصے حذف کرنے کے علاوہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ جو مقبولیت "تنقیدیں اور خاکے" کو حاصل ہوئی وہی اس مجموعے کو بھی ہوگی۔ اس کتاب کی ترتیب بھی میری رفیقۂ حیات کے اصرار کی رہین منت ہے جن کا مجھے شکر گزار ہونا چاہئیے۔

جلیل قدوائی

۱۴ر نومبر ۱۹۵۲ء

بیدار اور اُن کا اُردو دیوان[1]

علی گڑھ میں بدایوں کے رہنے والے ایک سیلانی بزرگ مولوی حضور احمد پُرانی کتابوں اور بدایوں کے پیڑوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ پھرتے پھراتے سال میں دو ایک مرتبہ وہ میرے پاس بھی تشریف لے آتے ہیں۔ پرانی کتابیں کبھی کبھی لیکن پیڑے میں اُن سے بہت دفعہ خرید چکا ہوں۔ اُن کے ذریعہ سے بعض نادر و نایاب کتابیں مشتاقان ادب کو مل جاتی ہیں۔ علی گڑھ ہی کے حبیب گنج میں جو ایک پرانی کتابوں کے کیڑے اور عاشق زار اور بزرگ قوم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رہتے ہیں اُن کے مشہور کتب خانے میں بھی ان حضرت کی بدولت پرانی کتابیں پہونچ جاتی ہیں۔ میری خوش قسمتی سے ایک مرتبہ، کوئی چھ سال ہوئے، وہ میرے پاس ایک قلمی کتاب لائے جسے میں نے اپنے کتب خانے کے لئے ان سے

---

[1] ۔ بیدار پر میرا ایک مضمون ہندستانی اکیڈمی، یو پی الہ آباد کے سہ ماہی "رسالہ ہندستانی" بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اکیڈمی مذکور نے میرا مرتب کردہ "دیوان بیدار" شائع کیا تو اس مضمون کو مقدمہ بنایا۔ موصوف مضمون اس مقدمہ کی

خرید لیا۔ پہلی نظر میں ایک ہی جلد میں بندھے ہوئے یہ کسی گم نام شاعر کے دو دیوان معلوم ہوئے مگر تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ یہ میر محمدی بیدار دہلوی کا اُردو اور فارسی کلام ہے۔ اس علم کا ہونا تھا کہ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شوق ہوا کہ دیگر اربابِ ذوق سے اس کا تذکرہ کروں اور اس گنج بے بہا کو بازار میں لاؤں۔ چنانچہ اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ جلد سے جلد یہ فرض ادا کروں گا اور در اصل مضمون اب تک تیار ہو کے کب کا چھپ گیا ہوتا لیکن بعض خانگی وجوہ سے یہ نیک ارادہ اب تک پورا نہ ہو سکا۔ بہرحال آج کی صحبت میں بیدار کے جو حالات مجھے معلوم ہو سکے وہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور سردست صرف اُن کے اُردو کلام پر بحث و تبصرہ کروں گا، فارسی کلام پر تبصرہ کسی آئندہ فرصت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔

میر محمد علی[۱] عرف میر محمدی المتخلص بہ بیدار دہلی محلہ عرب سرائے کے رہنے والے اور میر و سودا کے ہمعصر تھے۔ انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کی اور استادی کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ مولانا محمد فخر الدین دہلوی کے مرید تھے اور انھیں کے فیضان صحبت سے انھوں نے طریقۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کی اور لباس درویشی اختیار کر کے آخر خرقۂ خلافت پہنا۔ مرنے سے کچھ دن پہلے دہلی چھوڑ کر آگرہ چلے گئے اور کٹرہ دنداں فیل میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ کلام ان کا بہت بامزہ اور جابجا معرفت و اخلاق میں ڈوبا ہوا ہے۔ بیدار کا دیوان عام طور

---

[۱] تذکرہ "گل رعنا" مولفہ حکیم مولوی عبدالحئی مرحوم، صفحہ ۲۰۰۔

پر نہیں ملتا، نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ میرے علم میں علی گڑھ میں اُس کا ایک نسخہ مولوی احسن مارہروی صاحب کے پاس ہے۔ ایک نسخہ حیدر آباد میں مولوی عبدالحق صاحب کے پاس ہے اور مولانا حسرت موہانی نے بھی بیدار کا دیوان دیکھا ہے کیونکہ انھوں نے اُن کے کلام کا انتخاب عرصہ ہوا رسالہ "اُردوئے معلّٰی" میں چھاپا تھا اور جگہ بھی شاید اس کے نسخے ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔ تعجب ہے کہ بیدار کے کلام کے ہوتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی اشاعت کی اب تک فکر نہ کی۔ بلکہ کچھ دن ہوئے انجمن ترقی اردو نے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مقدمہ کے ساتھ دیوان یقین شائع کیا ہے۔ اس مقدمہ کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ یہ مرزا صاحب کے "لطائف وظرائف" میں سے ہے یا واقعاً انھوں نے سنجیدگی سے یہ کام کیا ہے، تاریخی حیثیت سے انعام اللہ خاں یقین کی شہرت اور ان کے دیوان کی اشاعت کی ضرورت مسلّم، لیکن جہاں تک حسن بیان، لطف کلام اور شاعرانہ کمال کا تعلق ہے، مرزا صاحب معاف فرمائیں اگر میں عرض کروں کہ انھوں نے ضرورت سے زیادہ عقیدت سے کام لیا ہے۔ یقین کا کلام بہ حیثیت مجموعی روکھا پھیکا اور بے لطف ہے اور بیدار کے کلام کے مقابلہ میں تو اس کے اشعار بالکل بے رنگ و ذائقہ معلوم ہوتے ہیں! مگر اسے کیا کیجیے ع

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

قدیم اُردو تذکرہ نویس، شعرا کے حالات زندگی عام طور پر اور بیدار کے متعلق معلومات خصوصیت کے ساتھ بہت کم دیتے ہیں۔ میر حسن

ہی صرف ایک ایسے بزرگ پائے گئے جنھوں نے اپنے تذکرہ میں بیدار سے کسی قدر ذاتی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں "قریب چہاردہ سال شدہ باشد کہ فقیر اورا در لباس درویشی در شاہجہان آباد دیدہ بود۔ طبع دردمند داشت، باریک و منحنی، بہ زیور علم و حیا آراستہ، معلوم نیست کہ الحال کجا است[۵۱]" "تذکرہ شعرائے اُردو" کی تالیف کا زمانہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ ہجری کے مابین ہے[۵۲]۔ اگر بیدار کا حال میر حسن نے ۱۱۹۰ھ ہجری میں لکھا تو ظاہر ہے کہ ۱۱۷۶ھ ہجری کے لگ بھگ انھوں نے بیدار کو لباس درویشی میں دیکھا تھا۔ اسی کے ساتھ میر تقی میر کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ فرماتے ہیں "جوانے است از یاران مرتضیٰ قلی بیگ فراق، مصرعۂ ریختہ درست موزوں می کند[۵۳]" اس کے بعد بیدار کا یہ ایک شعر پیش کرتے ہیں جو تذکرہ میر حسن اور دوسرے پرانے تذکروں میں بھی پایا جاتا ہے:-

صفا الماس و گوہر سے فزوں ہے تیرے دنداں کو
کیا تجھ لب نیں ہم رنگ خجالت لعل و مرجاں کو[۵۴]

---

[۵۱] "تذکرۂ شعرائے اُردو" مؤلفہ میر حسن، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء صفحہ ۶۵۔

[۵۲] مقدمہ "تذکرہ شعرائے اُردو" صفحہ ۲۔

[۵۳] "نکات الشعرا" مؤلفہ میر تقی میر، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، صفحہ ۱۴۰۔

[۵۴] یہ شعر غلط ہے۔ دیوان بیدار میں اس طرح پر کوئی غزل نہیں۔ یہ مطلع اصل میں یوں صحیح ہے:-

صفا الماس و گوہر سے فزوں ہے تیرے دنداں کی
کہاں تجھ لب کے آگے قدر و قیمت لعل و مرجاں کی

معلوم ہوتا ہے کہ گو بیدارؔ میرؔ کے ہم عصر تھے لیکن تذکرۂ میرؔ کی تحریر کے وقت وہ کم عمر اور غیر معروف ہوں گے ورنہ میرؔ صاحب اُن کے کلام کی دل کھول کر داد دیتے کیونکہ آزاد کے قول کے خلاف[۵۱] میرؔ صاحب نے اپنے تذکرہ میں جس انصاف اور بے لاگ اظہار رائے کا ثبوت دیا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ سجادؔ اکبرآبادی کے حال میں جنھیں وہ "مرد طالب علم" لکھتے ہیں، اور ان کے اشعار کے انتخاب میں انھوں نے تیرہ صفحے صرف کئے ہیں اور ان کے اس شعر پر ؂

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

لکھتے ہیں "ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن ایں شعر تواجد دست بہم می دہد، از بس کہ از خواندن ایں شعر حظے بر می دارم، می خواہم کہ بصد جا بنویسم[۵۲]" نکات الشعرا کی تالیف کا زمانہ ۱۱۶۴ھ اور ۱۱۶۶ھ ہجری کے مابین[۵۳] ہے۔ اگر میرؔ صاحب نے بیدارؔ کا حال ۱۱۶۵ھ ہجری میں لکھا تھا اور ہم اندازاً بیدارؔ کی عمر اس وقت بیس سال کی مان لیں

---

۵۱ میرؔ کی بد دماغی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ میرؔ نے نکات الشعرا کے دیباچہ میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھنے کو کہا ہے "ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا" (آب حیات مطبوعہ کریمی پریس لاہور صفحہ ۲۱۱)

۵۲ "نکات الشعرا" صفحہ ۷۵۔

۵۳ مقدمۂ "مخزن نکات"، نوشتہ مولوی عبدالحق، صفحہ ۶۔

تو ان کی تاریخ پیدائش ۱۱۴۵ھ ہجری ہوئی[1] اس حساب سے گویا میر حسن نے انھیں کم و بیش اکتیس سال کی عمر میں درویشی کے حالت میں دیکھا تھا۔ یہ خیال رہے کہ میر حسن نے ہر چند کہ چودہ برس پیشتر بیدار کو لباس درویشی میں دیکھا تھا پھر بھی وہ انھیں اپنے تذکرہ میں "جوان محمد شاہی" ہی لکھتے ہیں قائم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "از چندے تغیر لباس کرد۔ باستغنائے تمام بسر برد[2]" یہ تذکرہ میر تقی کے تذکرہ سے دو چار سال بعد کا ہے[3] اس سے اس واقعہ کی کہ بیدار نے نو عمری میں درویشی لے لی تھی تائید ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحئی مرحوم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ بیدار نے ۱۲۰۹ھ ہجری میں وفات پائی، اس حساب سے اُن کی عمر چونسٹھ برس کی ہوئی۔ افسوس ہے کہ قدیم شعرا کے حالات جمع کرتے وقت ہمیں صرف قیاسات اور حسابات سے کام لینا پڑتا ہے اور تذکرہ نویس اس باب میں بہت کم اعانت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ قیاسات غلط ہوں مگر کم از کم اس سے شاعر کے زمانہ اور عمر کا کسی نہ کسی حد تک صحیح تعین ضرور ہو سکتا ہے۔

پرانے تذکروں میں سے "نکات الشعرا" مولفہ میر تقی، "مخزن نکات" مولفہ قائم، "چمنستان شعرا" مولفہ شفیق اور "تذکرہ شعرائے اُردو" مولفہ میر حسن

---

[1] واضح ہو کہ "نکات الشعرا" خود میر صاحب کے شباب کا کارنامہ ہے۔ اس لئے بیدار کی عمر تذکرہ کی تحریر کے وقت بیس بائیس سال سے زائد ماننا خلاف قیاس ہوگا۔

[2] "مخزن نکات"، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، صفحہ ۶۳۔

[3] مقدمہ "مخزن نکات"، صفحہ ۶۔

میں بیدار کے حال میں صرف تین تین چار چار سطریں لکھ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان میں سے بھی بعض میں حالات اور اشعار کہیں ایک دوسرے کے حوالے سے کہیں بغیر حوالہ صرف نقل کر دیئے گئے ہیں۔ میر صاحب بیدار کو "ازیاران مرتضیٰ قلی بیگ فراق" لکھتے ہیں۔ میر حسن "از شاگردان مرتضیٰ قلی بیگ فراق" بتاتے ہیں۔ مرزا علی لطف لکھتے ہیں "دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے، نزاکت سے معنی کی بخوبی آشنا اور زباں دانان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کلام اپنا انھوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے اور اس نقاد بازار معانی سے فائدہ بہت سا اٹھایا ہے[1]" صاحب "سخن شعرا" "شاگرد مرتضیٰ قلی خاں فراق[2]" بتاتے ہیں شیفتہ نے بھی لکھا ہے "از شاگردان مرتضیٰ قلی بیگ فراق شمردہ می شود[3]" جدید تذکرہ نویسوں میں سے آزاد کے ہاں بیدار کا ذکر نہیں ہے صاحب شعر الہند لکھتے ہیں "خواجہ (میر درد) صاحب کے صاحب دیوان شاگرد ہیں اور زباں دانان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں[4]" یہ مضمون غالباً انھوں نے "گلشن ہند" سے اڑایا ہے۔ قدرت اللہ شوق ان کو مرتضیٰ قلی بیگ فراق کا شاگرد کہتے ہیں اور میر صاحب نے بھی ان کو انھیں کا شاگرد لکھا ہے۔

---

[1] "گلشن ہند" مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور، صفحہ ۵۹۔

[2] "سخن شعرا" مولفہ عبدالغفور خاں نساخ، مطبوعہ نول کشور پریس، صفحہ ۷۴۔

[3] "گلشن بے خار" مطبوعہ نول کشور پریس، صفحہ ۳۵۔

[4] "شعر الہند" صفحہ ۱۴۲۔

مولوی عبدالحیٰ صاحب نے کسی قدر تفصیل سے کام لیا اور ہر چند کہ اُنھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا وہ بیدار کو اُردو میں خواجہ میر دردؔ اور فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ خود بیدارؔ کے اُردو کلام میں کوئی ایسی غزل یا نظم نہیں جس سے اُن کے دردؔ کے شاگرد ہونے کا قطعی ثبوت بہم پہنچے، ضرور ہے کہ انھوں نے دردؔ کی طرح پر غزلیں بہت سی کہی ہیں اور کہیں کہیں اپنی غزلوں میں دردؔ کے اشعار ضم کئے ہیں اور اُن کی غزلوں پر تضمینیں بھی کہی ہیں۔ حضرت دردؔ کی وفات پر جو قطعۂ تاریخ بیدارؔ نے فارسی میں لکھا ہے اُس میں بھی اُنھوں نے اپنے کو "از غلامانش یکے" ہی لکھا ہے جس کے معنی "یکے از معتقدین او" بھی ہو سکتے ہیں۔ صاف صاف شاگردی کی تصریح نہیں کی۔ وہ قطعہ یہ ہے :-

آفتابِ امتِ دینِ محمدؐ، خواجہ میر
منظہرِ علم علی و وارث اثنا عشر
حضرت دردؔ آں کہ از درد فراق عندلیب
نالۂ یا تا عرش می کرد بر دلہا اثر
حیف کز دنیا بہ عمرِ شصت و ہشتم سالگی
جانبِ اعلیٰ علیین او کردہ سفر
بندۂ بیدارؔ کاں ہست از غلامانش یکے
جست از وقت وصال و روز و ماہش چوں خبر
یک پہر شب ماندہ ہاتف کرد و او یلا و گفت

ہائے بود آدینہ و بست و چہارم از صفر[۱]

تذکرہ نویسوں کا یہ اختلاف آرا اور اجتماع ضدین بے حد پریشان کن ہے اور بیدار کی تلمیذ کی نسبت بغیر مکمل تحقیق کے میرا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ عام طور پر درد ہی کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں چنانچہ مجھے دوران تحقیق میں حکیم آغا جان عیش دہلوی کا ایک مقطع ملا ہے جس کے دیکھنے کے بعد لطف اور مولوی عبدالحیٔ کا یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ بیدار اردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مجرم کا میں شاگرد وہ بیدار کے شاگرد
ہے عیش سلسلہ مرا یوں درد و اثر تک[۲]

بہرحال جہاں تک قوی روایات کا تعلق ہے غالباً اس بات کو مان لینا

---

[۱] مقدمہ دیوان درد، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں نوشتہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، صفحہ ۵، مگر یہ قطعہ بیدار کے فارسی دیوان میں جو میرے پاس ہو مجھے نہیں ملا، حالانکہ اس میں بہت سے قطعات تاریخ ہیں، منجملہ ان کے اپنے مرشد مولانا فخرالدین دہلوی کے وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ بھی موجود ہے۔ اسی مقدمہ میں مولانا شروانی نے خواجہ میر درد کے شاگردوں اور اُن شعرا کے نام دیئے ہیں جو اُن کے فیض صحبت سے سیراب ہوئے، اس فہرست میں بیدار کا نام نہیں ہے۔

[۲] مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے رسالہ اُردو جلد ۸ حصہ ۳۲ میں حکیم آغا جان عیش پر ایک مضمون لکھا تھا جو اَب "مضامین فرحت" میں شامل ہے۔ یہ شعر اسی مضمون سے نقل کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے ایک فٹ نوٹ میں بیدار کا بھی تین چار سطروں میں

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

چاہیئے کہ بیدار اردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اس کا ایک قیاسی حال درج ہے اور انھیں درد و اثر کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ ممکن ہے درد کے انتقال کے بعد بیدار نے اثر سے بھی اصلاح لی ہو۔ اس شعر سے میرے کام کی دو باتیں نکل آئیں ایک تو یہ کہ بیدار حضرت درد کے شاگرد تھے۔ دوسرے یہ کہ بیدار بعد میں خود بھی استاد صاحب تلامذہ ہوئے۔ صاحب شعر الہند نے "تذکرۂ قدرت قلمی" کے حوالہ سے تلامذۂ بیدار میں صرف شیخ محمد حاجی حشمت کا نام لکھا ہے جن کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نہیں ہے خوف مجھے گو کہ سب جہاں پھر جائے
پہ یہ غضب ہے جو وہ یار مہرباں پھر جائے

کہیں ہیں لوگ مجھے دیکھ کوئے قاتل میں
الٰہی یاں سے سلامت یہ نوجواں پھر جائے

(شعر الہند جلد، اول، صفحہ ۱۶۰)

اس شعر نے تلامذۂ بیدار میں مجرم یعنی حکیم آغا جان عیش کے استاد کا اور اضافہ کیا۔ اُن کے مختصر حالات یہ ہیں:۔

مجرم تخلص، رحمت اللہ نام، آگرہ کے رہنے والے تھے، کندلہ کشی کرتے تھے، پھر فقیر ہو گئے۔ پھرتے پھراتے دہلی پہونچے، بیدار کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں یہیں رہے وہاں سے بریلی چلے گئے۔ بڑے ظریف اور طبّاع تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

نگر دزدیدہ کیوں پھینکے ہو تو اے امت عیسیٰ
دل و سینہ کو توڑے ہے یہ پستول فرانسیسی

یہی ہے آرزو روز جزا میں اپنی اے مجرم
علی کی غاشیہ داری ہو اور دُلدُل کی سائیسی

(اُردو)

ثبوت خود بیدار کے کلام کی سادگی و شیرینی اور اس کا ایک حد تک عارفانہ رنگ ہے۔ بیدار کی بعض غزلیں تو بالکل ایسی ہیں کہ اگر مقطع نکال دیا جائے تو بلا پس و پیش انھیں درد کی غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحیٔ مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ بیدار نے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ میرے لئے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں کہ ایک دیوان اُردو اور ایک فارسی کا ہے اور دونوں کا ایک ایک نسخہ خوش قسمتی سے میرے پاس[۱] ہے۔ مگر مختلف تذکروں سے مقابلہ کرنے پر یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بعض اشعار یا غزلیں میرے نسخے میں نہیں ہیں جس سے گمان ہو سکتا ہے کہ دونوں دیوان اُردو کے تھے۔ لیکن چونکہ ایسی غزلوں کی تعداد کم ہے اس لئے زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی بے پروائی سے نقل ہونے سے رہ گئیں یا کسی اور کی غزلیں ہیں جو بیدار کے نام سے مشہور ہو گئیں جیسا کہ آگے چل کر ایک مثال سے ظاہر ہو گا۔

دیوان بیدار بانگ درا کے سائز کے ۱۴۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اگر شائع کیا جائے تو دیوان درد کے برابر حجم ہو گا۔ کاغذ پرانا، بادامی، چکنا، کہیں سے خراب نہیں ہوا ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی ۲۲۶ غزلیں ہیں، ۲۶ رباعیاں، ۲ نعتیہ مسدس اور ۱۱ مخمس۔ ان گیارہ میں سے ایک خود اپنی غزل پر تضمین سمجھئے۔ یہ غزل دیوان میں دوسری غزلوں کے ساتھ نہیں ہے اور اس کا مقطع بھی وہ نہیں ہے جو عام طور پر مختلف تذکروں میں ملتا ہے، یعنی یہ مقطع نہیں ہے

چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو

جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا[1]

باقی تین تضمینیں خواجہ حافظ کی غزلوں پر، دو دو خسرو، درد اور سودا کی غزلوں پر اور ایک تضمین قائم کی غزل پر۔ دیوان کی ترتیب میں یہ جدت ہے کہ ردیف وار غزلوں کے ساتھ رباعیاں بھی درج ہیں۔ کتابت باریک ہے اور جا بجا املا اور ہجا کی غلطیاں ہیں۔ کاتب کا نام نبی بخش ہے خوش خط نہیں ہے۔ خود اعتراف کرتا ہے "بہ خط بد خط نبی بخش" مگر کتابت صاف ہے۔ سال کتابت درج نہیں[2]۔ لیکن بیدار کی زندگی کے زمانہ کا نسخہ نہیں ہے کیونکہ آخر میں خود لکھا ہے "تمام شد دیوان من تصنیف مولوی محمدی بیدار صاحب اکبر آبادی مرحوم و مغفور" بیدار کو اکبر آبادی غلط لکھا ہے۔ چونکہ آگرہ میں وفات ہوئی اس لئے غلطی سے معلوم ہوتا ہے اکبر آبادی مشہور ہو گئے تھے۔

بیدار کے کلام کی عام خصوصیات کم و بیش وہی ہیں جو میر و سودا

---

[1] تذکرہ میر حسن اور دوسرے تذکروں میں یہ شعر بیدار سے منسوب ہے مگر اصل میں یہ شعر میر کا ہے اور یوں صحیح ہے:۔

اب تو جاتا ہی ہے کعبہ کو تو بت خانہ سے　　　جلد پھر یو تجھے اے میر خدا کو سونپا

(نکات الشعرا، صفحہ ۱۶۵)

[2] کتاب کے خاتمہ پر یا شروع میں تاریخ کتابت کے طور پر کہیں سال وغیرہ نہیں درج ہے لیکن جلد کھولتے ہی جو ورق ملتا ہے اس کے ایک کنارے پر کسی دوسرے خط میں بالکل غیر متعلق طریقہ پر "یکم ماہ فروری ۱۸۳۲ء" لکھا ہے۔

اور ان کے معاصر شعرا کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں یعنی زبان کی صفائی، دل کش و دل پذیر محاورات، ندرت بیان، معتدل حد تک تشبیہ و استعارہ کا استعمال، سوز و اثر وغیرہ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ خواجہ میر دردؔ کے رنگ میں ہے اور بعض غزلیں تو شروع سے آخر تک مسلسل تصوف و اخلاق کے مضامین سے لبریز ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ غزل سے امرد پرستی، بوالہوسی اور عامیانہ اظہار عشق کے مضامین نکال کے مرزا مظہرؔ جان جاناں، خواجہ میر درد، میر اور سوداؔ نے جو اس میں تصوف اور اخلاق کا رنگ بھرا اور ایک شریفانہ و مہذب قالب غزل کے لئے مہیا کیا اُس کوشش میں میر محمدی بیدارؔ کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ مولوی عبدالحیٔ بیدارؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں "میر و مرزا کے ہم عصر تھے۔ جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدارؔ نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بہ قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا" یہ رائے دیوان بیدارؔ کے مطالعہ کے بعد حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بیدارؔ کو دردؔ سے بڑی عقیدت ہے۔ دیوان کی سب سے پہلی غزل جو حمد باری تعالیٰ میں ہے اسی طرح میں ہے جس میں دردؔ کی پہلی غزل۔ ناظرین رنگ کے متعلق خود غور فرمائیں، ملاحظہ ہو ؎

ہے نام ترا باعث ایجاد رقم کا
محتاج نہیں وصف ترا لوح و قلم کا

تجھ گنجِ محبت کا طلبگار پھروں ہوں
نے طالبِ دینار نہ مشتاق درم کا
دل صاف کر آلایشِ دنیا سے کہ یہ دل
آئینہ ہے اسکندری و جام ہے جم کا
ٹک دیدۂ دل کھول کے تو دیکھ کہ رخشاں
ہر ذرۂ حادث میں ہے خورشید قدم کا
ہو جلوہ گر آئینۂ تشبیہ میں تنزیہ
گر تفرقہ اُٹھ جائے وجود اور عدم کا
اس ہستیٔ موہوم پہ غفلت میں نہ کھو عمر
بیدار ہو آگاہ بھروسا نہیں دم کا!

ذیل میں دردؔ اور بیدارؔ کی کچھ ہم طرح غزلیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو بیدارؔ کے رنگِ کلام کی نسبت زیادہ آسانی سے اور بہتر رائے قایم کرنے کا موقع ملے۔

دردؔ[1]	بیدارؔ
جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا	اُس ستمگر سے جو ملا ہو گا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہو گا	اس نے کیا کیا ستم سہا ہو گا

---

[1] دردؔ کی یہ غزلیں دیوانِ دردؔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سے نقل کی گئی ہیں جس کی طباعت و اشاعت مخدومی و معظمی ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے اور جس کی صحت کی تصدیق مولانا شروانی نے اپنے مقدمہ میں کی ہے۔

دردؔ

اُن نے قصداً بھی میرے نالہ کو
نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
حال مجھ غم زدے کا جس تس نے
جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

قطعہ

میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں
بن کئے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اُس کو اثر خدا جانے
نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا
دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

بیدارؔ

آہ قاصد تو اب تلک نہ پھرا
دل دھڑکتا ہے کیا ہوا ہوگا
اے صبا گل تو کھل چکے پہ کبھو
غنچۂ دل مرا بھی وا ہوگا

قطعہ

ہے یقیں مجھ کو تجھ ستمگر سے
دل کسی کا اگر لگا ہوگا
نالہ و آہ کرتے ہی کرتے
ایک دن یوں ہی مر گیا ہوگا
کوئی ہوگا کہ دیکھ اسے بیدارؔ
دل و دیں لے کے بچ رہا ہوگا

جی میں ہے سیر عدم کیجئے گا
یک بہ یک خلق سے رم کیجئے گا
مورد قہر تو یاں ہم ہی ہیں
اور کس پر یہ کرم کیجئے گا
سخت بے باک ہے یہ خامۂ شوق
اپنے ہاتھوں کو قلم کیجئے گا

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا
بھاگنا خلق سے کچھ کام نہیں
قصد ہے آپ سے رم کیجئے گا
گر رہی یوں ہی گل افشانی اشک
جا بجا رشک ارم کیجئے گا

درد

ٹک بھی گردوں نے اگر فرصت دی
عیش کو کشتۂ غم کیجئے گا

گرمیِ اشک سے مانندِ شراب
آب و آتش کو بہم کیجئے گا

سینہ و دل کے تئیں داغوں سے
رشکِ گل زارِ ارم کیجئے گا

بیدار

گر یہی زلف و[۱] یہی مکھڑا ہے
غارتِ دیر و حرم کیجئے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجئے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز
کہیئے کس روز کرم کیجئے گا

درد

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا

کیوں بھنویں تانتے ہو بندہ نواز
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

بیدار

اس نے یاں تک کبھی گزر نہ کیا
تو نے اے آہ کچھ اثر نہ کیا

کیوں عبث تیوری بدلتے ہو
میں تو نظارہ بھر نظر نہ کیا

یوں ہی یوں ہی عتاب فرما ہو
نذر کب میں دل و جگر نہ کیا

---

[۱] یہ عطف میر حسن کے ہاں بھی جائز ہے ؎

جہاں میں ہے اندوہ و عشرت بہم
کہیں صبحِ عیش و کہیں شامِ غم

(مثنوی سحر البیان، مطبوعہ نول کشور پریس، سنہ ۱۹۲۵ء، صفحہ ۸۶)

درد

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

بیدار

خوں ہوا دل برنگ لالہ تمام
پر کبھو ہم نے نالہ سر نہ کیا
حیف بیدار تیری آنکھوں میں
خواب نے ایک شب بھی گھر نہ کیا

مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا
یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے
غم رہ گیا کبھو کبھو آرام رہ گیا
سو بار سوز عشق نے دی آگ پر ہنوز
دل وہ کباب تھا کہ جگر خام رہ گیا
مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے
اب گاہ گاہ بوسہ بہ پیغام رہ گیا
ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

اہل کمال سے جو ہوا کام رہ گیا
تا حشر یادگار جہاں نام رہ گیا
دل خوں برنگ لالہ ہوا انتظار میں
آتے ہی آتے ساقی گل فام رہ گیا
کملائے گل کا حال نظر کر فسردہ ہو
جو پھول یاں سحر کو کھلا شام رہ گیا
جب سے کہ درد عشق ہوا دل میں آ مقیم
کیا جانے یاں سے جا کدھر آرام رہ گیا
صیاد مست ناز نے آ کر خبر نہ لی
آخر تڑپ تڑپ میں تہ دام رہ گیا

اپنے بندے پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آ جائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

ایک دن وصل سے اپنے مجھے تم شاد کرو
پھر مری جان جو کچھ چاہو سو بیداد کرو

بیدار	درد
نہ کہیں عیش تمہارا ابھی منغص ہو جائے	آپ کی چاہ سے چاہیں ہیں مجھے سب ورنہ
کون پھر یاد کرے تم نہ اگر یاد کرو	دوستاں درد کو مجلس میں نہ تم یاد کرو

اخلاق و تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی چند غیر طرح غزلیں ملاحظہ ہوں، اشعار کی یک رنگی، ہمواری اور تسلسل مضامین کی بابت ناظرین خود انصاف فرمائیں ؎

کہاں ہم رہے پھر کہاں دل رہے گا
اسی طرح گر تو مقابل رہے گا

کھلی جب گرہ بند ہستی کی تجھ سے
تو عقدہ کوئی پھر نہ مشکل رہے گا

دل خلق میں تخم احساں کے بو لے
یہی کشت دنیا کا حاصل رہے گا

حجاب خودی اُٹھ گیا جب کہ دل سے
تو پردہ کوئی پھر نہ حائل رہے گا

نہ پہونچے گا مقصد کو کم ہمتی سے
جو سالک طلب گار منزل رہے گا

نہ ہوگا تو آگاہ عرفان حق سے
گر اپنی حقیقت سے غافل رہے گا

خفا مت ہو بیدار اندیشہ کیا ہے

ملا گر نہ وہ آج کل پہ رہے گا

تنہا نہ دل ہی لشکرِ غم دیکھ ٹل گیا
اس معرکہ میں پائے تحمل بھی جل گیا

ہیں گرم گفتگو گل و بلبل چمن کے بیچ
ہوگا خلل صبا جو کوئی بات ہل گیا[۱]

منعم تو یاں خیال عمارت میں کھو نہ عمر
لے کون اپنے ساتھ یہ قصر و محل گیا

اُس راہ رو نے دم میں کیا طے رہ عدم
ہستی کے سنگ سے جو شرر سا اُچھل گیا

دیکھا ہر ایک ذرہ میں اُس آفتاب کو
جس چشم سے کہ کج نظری کا خلل گیا

گزری شب شباب ہوا روز شیب اخیر
کچھ بھی خبر ہے قافلہ آگے نکل گیا

---

[۱] ٹل اور کل کے ساتھ ہل کا قافیہ درد کے ہاں بھی ہے :-

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا
اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا
میں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹھ اس کا بھی درد ہل گیا تھا

قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرائے
منزل ہے دور خواب سے اُٹھ، دن تو ڈھل گیا[1]

تھا جو کچھ ہونا سوائے دل ہو گیا — پھر بھلا کہہ کس پہ مائل ہو گیا
شمع سے روشن ہوا یہ نکتہ رات — سر سے جو گزرا سو کامل ہو گیا
مجھ میں اور اس میں نہ تھا ہرگز حجاب — پردۂ ہستی ہی حائل ہو گیا
اشک کے مانند راہ عشق میں — رکھتے ہی پا قطع منزل ہو گیا
کیا کیا بیدار تو نے ہے غضب! — ایسے ظالم کے مقابل ہو گیا

کچھ نہ ایدھر ہے نے اُدھر تو ہے — جس طرف کیجئے نظر تو ہے
اختلاف صور ہیں ظاہر میں — ورنہ معنی یک دگر تو ہے
کیا مہ و مہر کیا گل و لالہ — جس میں دیکھا تو جلوہ گر تو ہے
ہے جو کچھ تو سو تو ہی جانے ہے — کوئی کیا جانے کس قدر تو ہے
کس سے تشبیہ دیجئے تجھ کو — سارے خوباں سے خوب تر تو ہے
تھک گئے ہم تو جستجو میں تری — آہ کیا جانیے کدھر تو ہے

وہ تو بیدار ہے عیاں لیکن
اس کے جلوے سے بے خبر تو ہے

---

[1] میر :۔

صبح گزری شام ہونے آئی میر — تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

مندرجۂ بالا نمونوں سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ بیدؔار کے کلام میں کس حد تک سوز و گداز درد و اثر، سادگی و نرمی اور تصوف و اخلاق کی چاشنی پائی جاتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ بیدار کا تمام کلام ایسا ہی ہے اور دیوان دؔرد کی طرح دیوان بیدؔار بھی سر سے پاؤں تک رموز و اسرار اور معرفت و اخلاق کا گنجینہ ہے اور بقول میر حسن کلام حاؔفظ کی طرح "سراپا انتخاب" ہے غلط ہے۔ اب میں بیدؔار کے کلام کے بعض اور خصوصیات بیان کرتا ہوں اور ان کی کمزوریوں کی طرف بھی موقع سے اشارہ کروں گا۔

یہاں میں ناظرین کو عبدالحیؒ مرحوم کے وہ الفاظ پھر یاد دلانا چاہتا ہوں جو پچھلے صفحوں میں پیش کر چکا ہوں یعنی یہ الفاظ کہ بیدؔار نے "صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بہ قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا" معلوم نہیں مولوی عبدالحیؒ مرحوم کی نظر سے دیوان بیدؔار گزرا تھا یا نہیں لیکن ان کی یہ رائے بالکل صحیح اور جچی تلی ہے۔ "بہ قدر مناسب تصوف کا رنگ" جیسے بیدار نے "صفائی کے ساتھ" اپنے کلام میں شامل کیا ہے آپ نے دیکھ لیا۔ اُن کا باقی کلام کم و بیش حسب ذیل خصوصیات سے مملو ہے:۔

(۱) اُن کے اشعار میں مؔیر و مرؔزا اور ایک حد تک خود خواجہ میر دؔرد کے مقابلہ میں انداز بیان کا لطف اور صفائی زبان کا مزہ زیادہ پایا جاتا ہے اور اس حیثیت سے اُن کا کلام اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ بعض بعض جگہ ڈیڑھ دو سو برس پرانا ہونے کے بجائے دور جدید کا تغزل معلوم ہوتا ہے مثلاً ؎

کارواں منزل مقصود کو پہونچا کب کا

اب تک اے وائے میں یاں کوچ کے ساماں میں رہا[۱]
نرگس کی طرح باغ میں اب چشم وا کیے
حیرت فریب کس کے میں ہوں انتظار کا

ہم نشیں پوچھ نہ باعث تو مری زاری کا
یہ ثمر مجھ کو ملا دل کی گرفتاری کا
گر قدم رنجہ کرے بہر عیادت وہ ادھر
شکر سوچی سے بجا لائیے بیماری کا
چاہتا ہوں میں تجھے اس پہ جو چاہو سو کہو
ہوں مقر آپ میں اس اپنی گنہگاری کا[۲]

---

[۱] مولانا حالی کا مشہور شعر ہے ؎
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
لیکن راقم کے نزدیک بیدار کے شعر میں حالی کے مقابلہ میں واقعیت زیادہ ہے، یعنی اسباب باندھنے میں ریل چھوٹ گئی نہ کہ انجن کی سیٹی کی دھن میں غرق ہونے کی وجہ سے۔

[۲] یہ تینوں شعر اور بعض اور اشعار جو انتخاب کیے گئے ہیں اپنی زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے مولانا حسرت موہانی کے معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ یہ خود ایک دلچسپ سوال ہے کہ حسرت کہاں تک قدیم رنگ اور انداز بیان میں شعر کہتے ہیں۔

دیدارِ یار تو نہ ہوا یاں نصیبِ چشم
قسمت میں تھا یہ دیدۂ خوں یار دیکھنا

کیفیتِ بہار ہے تجھ سے جو تو نہ ہو
بھاتا ہے پھر کسے گل و گلزار دیکھنا

قبول تھا کہ فلک مجھ پہ سو جفا کرتا
پر ایک یہ کہ نہ تجھ سے مجھے جدا کرتا

کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجوں
تا کہ معلوم کرے حالِ پریشاں میرا[۵]

---

[۵] اس شعر کا غالب کے اس شعر سے موازنہ کیجئے ؎

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

دونوں کے اندازِ بیان میں جو فرق ہے اسے اہلِ ذوق خود محسوس کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ غالبؔ کے شعر میں خیال کی جدت ہے اور بیدارؔ کے ہاں "زلف کی تصویر" سے "حالِ پریشاں" عیاں ہونا محض رعایت ہے اور ایک فرسودہ خیال، لیکن اولیت، اور جامعیت کے لحاظ سے بیدارؔ کا شعر لاجواب ہے۔ علاوہ اس کے غالبؔ کے شعر میں "کہ تا" پہلے مصرع میں اتوا کی بہت بری مثال ہے اور ایسے مقام پر واقع ہوا ہے کہ شعر کی صورت مسخ ہو گئی ہے اور جس کی نسبت، میرے منہ میں خاک، اقبال سہیل کا یہ قول کہ "رات کے سناٹے میں تالاب کے کسی اونچے کنارے سے کوئی کچھوا پانی میں آ رہی" یاد آتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (حضرت غالبؔ کی روح پاک سے معذرت)

جواب کے چھوڑے مجھے غم تری جُدائی کا
تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا

مرے قدم سے ہے سرسبز بوستان جنوں
ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا

ہیں گرم گفتگو گل و بلبل چمن کے بیچ
ہوگا خلل صبا جو کوئی بات ہل گیا؎

آج ہنس ہنس کے وہ کرتا ہے سخن حیراں ہوں
جس سے اک عمر سے میں طالب دشنام رہا

شتاب آ کہ نہیں تاب انتظار مجھے
ترا خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

؎ سوداؔ کے شاگرد میاں معینؔ کا بھی ایک مطلع سنیئے ؎

اے باد صبا باغ میں مت جائیو تڑکے شاید کہ وہ سوتا ہو کہیں پات نہ کھڑکے

لیکن بیدارؔ کے شعر میں "شعریت" کی جو حقیقی روح موجود ہے اور الفاظ و انداز بیان نے شعر کو جس قدر نازک حباب کی طرح ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جانے والی چیز بنا دیا ہے وہ معینؔ کے شعر کو نصیب نہیں جس میں "کرختگی" پائی جاتی ہے۔ بلکہ "پات نہ کھڑکے" سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ شاید معشوق پیپل کے درخت کے نیچے پلنگڑی ڈالے سو رہا ہے۔

سیا تو ہے پہ کوئی دم میں پھر گریباں کا
جدا جدا نظر آتا ہے تار تار مجھے
تمھاری چشم میں بخت سیہ نے اے خوباں
برنگ سرمہ دیا رنگ اعتبار مجھے
نگاہ مست نے ساقی کی بادۂ جاں بخش
دیا سبھوں کو رکھا کشتۂ خمار مجھے

ہم ہی تنہا نہ تری چشم کے بیمار ہوئے
اس مرض میں تو کئی ہم سے گرفتار ہوئے
رخ تاباں سے تمھارے کہ ہو خورشید مثال
در و دیوار سبھی مطلع انوار ہوئے
للہ الحمد کہ مدت میں تم اے نور نگاہ
باعث روشنی دیدۂ خوں بار ہوئے

گزر ہماری طرف کر تو اے نگار کبھی تو
کہ کامیاب ہوں ہم سے امیدوار کبھی تو
خزان ہجر تو دیکھوں ہوں مدتوں سے اے گل
ریاض وصل کی اپنے دکھا بہار کبھی تو
ٹک آ کے اے بت آرام جاں گلے سے مرے لگ
کہ آوے مجھ دل بے تاب کو قرار کبھی تو

اور یہ خوبیاں کچھ چھوٹی بحر کی غزلوں میں اور زیادہ نمایاں ہیں ؎

نپٹ دل ہے مشتاق اے یار تیرا
کہ دیکھے نظر بھر کے دیدار تیرا
تری چشم کا سخت بیمار ہوں میں
اگرچہ ہے ہر ایک بیمار تیرا

کل وہ جو پئے شکار نکلا — ہر دل ہو اُمیدوار نکلا
ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک — جی سے نہ ترے غبار نکلا
غم خوار ہو کون اب ہمارا — جب تو ہی نہ غم گسار نکلا[1]

عاشق نہ اگر وفا کرے گا — پھر اور کہو تو کیا کرے گا
مت توڑیو دل صنم کسی کا — اللہ[2] ترا بھلا کرے گا
ہے عالم خواب حال دنیا — دیکھے گا جو چشم وا کرے گا
کیا جانیئے کیا کرے گا طوفاں — گر اشک یوں ہی بہا کرے گا

---

[1] غالب :-

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

[2] "اللہ ترا بھلا کرے گا" پر انشاء کا "انشاء اللہ دیکھئے گا" یاد آیا، پورا شعر سنئے ؎

میں کیسی بناتا ہوں تم سے — انشاء اللہ دیکھئے گا !

بیدارؔ یہ بیت دردؔ رو رو فرقت میں تری پڑھا کرے گا

"اپنی آنکھوں میں تجھ کو دیکھوں[1]

ایسا بھی کبھو خدا کرے گا"

حیف ہے ایسی زندگانی پر کر فدا ہو نہ یار جانی پر

حال سن سن کے ہنس دیا میرا کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

خون کتنوں کا ہو گیا ہو گا تیری دستار ارغوانی پر

رات بیدارؔ وہ مہِ تاباں

سن کے رویا مری کہانی پر

آپ نے جو کہا کیا سب کو قبول ایک میرا ہی سخن ہے نا قبول

ایک دل ہے اے بتاں اپنی بساط نا قبول اس کو کرو تم یا قبول

بیدارؔ تو اس جہاں میں آکر جو چاہے سو میرے یار کیجو

پر جس سے گری کسو کے دل سے وہ کام نہ اختیار کیجو

---

[1] دیوان دردؔ، مطبوعہ نظامی پریس میں اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں

ہے ع

اپنی آنکھوں اسے میں دیکھوں

جانیں[1] مشتاقوں کی لب پر آئیاں | بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
صبح ہونے آئی، رات آخر ہوئی | بس کہاں تک شوخیاں مچلائیاں
جیب تو کیا ناصحا دامن کی بھی | دھجیاں کر عشق نے دکھلائیاں

دیکھتے ہی اس کو شیدا ہو گیا
کیا ہوئیں بیدار وہ دانائیاں

یہ عجیب و غریب قطعہ بھی ملاحظہ ہو:

کیا سوال میں بیدار سے کہ اے مہجور
کبھی بھی تو نے بھلا وصل دلستاں دیکھا
مفارقت ہی میں یا عمر کھوئی میری طرح
کہ عشق میں دل غمگیں نہ شادماں دیکھا
یہ سن کے رونے لگا اور بعد رونے کے
کہا نہ پوچھو جو کچھ میں نے اے میاں دیکھا
فراقِ یار و جفائے شماتت اعدا
غمِ دل و ستم پند ناصحاں دیکھا
نہ پائی ذرہ بھی اس اشک گرم کی تاثیر
نہ ایک دم اثر نالہ و فغاں دیکھا

---

[1] "آب حیات" میں آزاد نے یہ شعر سودا سے منسوب کیا ہے بہ خفیف تغیر:

بل بے ساقی تیری بے پروائیاں | جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں

جہاں میں وصل ہے، سنتا ہوں مدتوں سے ولیک

سوائے نام نہ اُس کا کہیں نشاں دیکھا

(۲) اُن کے ہاں جذبات و واردات عشق کے نہایت دل کش و موثر مرقعے ملتے ہیں جن میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اور جن میں ایک طرح کا ترنم اور جوش بھی موجود ہے۔ بہت سے اشعار جو درد کے رنگ میں اوپر پیش کیے جا چکے ہیں کم و بیش اس ذیل میں آتے ہیں لیکن وہ زیادہ تر تصوف کی شان رکھتے ہیں یہاں چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

ہم کلام اس سے میں یک بار نہ ہونے پایا

تھا مرے جی میں سو اظہار نہ ہونے پایا

حیف پژمردہ ہوا غنچۂ دل کھلتے ہی

زیب یک گوشۂ دستار نہ ہونے پایا

یوں ہی ہے عزم اپنا اس میں جو کچھ ہو پیارے

جی جائے یا رہے اب ملنا ضرور تیرا

مغتنم جانو ہم سے مخلص کو

ڈھونڈھیے گا تو پھر نہ پائیے گا

تجھ بن اے یار جفا کار عجب حالت ہے

دل جدا نالہ کناں چشم ہے خوں بار جدا

سیل اشکوں نے دیا خانۂ مردم کو بہا
چشم خوں بار سے طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا

پاس ناموس حیا تھا کہ نہ روئے ہیہات
ورنہ آنکھوں میں ہماری بھی بہا جیحوں تھا[۱]
کچھ تجھے بھی ہے خبر حال سے اس کے ظالم
رات بیکار ترے غم میں بہت محزوں تھا

اپنا تو ہوا تیرے نہ عدوں ہی میں کام آخر
کیا فائدہ جو تو اب اے وعدہ شکن آیا

تجھ بن ہے بے قرار دل اے ماہ کیا کروں
کٹتی نہیں ہے ہجر کی شب آہ کیا کروں
نے دل۔ دل ربا نہ مرے دل کو ہے قرار
حیراں ہوں اس میں اے مرے اللہ کیا کروں

پاوے کس طرح کوئی کس کو ہے مقدور ہمیں   لے گیا عشق ترا کھینچ بہت دور ہمیں

۱؎ غالب:—
میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے   اس کے جوش گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

یاں تو جی آن کے ٹھہرا ہے لبوں پر اپنا
آہ کیا جانے خبر اس کو وہاں ہو کہ نہیں

دل کو میں آج ناصحاں اُس کو دیا جو ہو سو ہو
راہ میں عشق کے قدم اب تو رکھا جو ہو سو ہو
عاشق جاں نثار کو خوف نہیں ہے مرگ کا
تیری طرف سے اے صنم جور و جفا جو ہو سو ہو
خواہ کرے وفا و مہر خواہ کرے جفا و جور
دلبر شوخ و سنگ سے اب تو ملا جو ہو سو ہو
یا وہ اٹھاوے مہر سے یا کرے تیغ سے جُدا
یار کے آج پاؤں پر سر کو دھرا جو ہو سو ہو

مت پوچھ تو جانے دے احوال کو فرقت کے
جس طور کٹے کاٹے ایام مصیبت کے
بیدار چھپائے سے چھپتے ہیں کوئی تیرے
چہرے سے نمایاں ہیں آثار محبت کے

اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے
اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

تجھ عشق کا دعویٰ نہیں اے یار زبانی
ہے شمع صفت داغ مرے دل پہ نشانی
کیا کیا نہ ترے جور و جفا میں نے اٹھائے
پر تو نے مری آہ کبھی قدر نہ جانی
گزری ہے جو کچھ دل پہ نہ آوے ہے زباں پر
بیدار نہیں حالت عشاق بیانی

تجھ بن ہے ایک دم نہیں آرام جاں مجھے
اس حال میں تو چھوڑ چلا اب کہاں مجھے
صورت کو اپنی آپ میں پہچانتا نہیں
ایسا کیا ہے غم نے ترے ناتواں مجھے

نہ کر بہار میں بلبل کو قید اے صیاد
کہ مثل شمع جلے گی وہ داغ میں گل کے

آہ جس دن سے تجھ سے آنکھ لگی
دل پہ ہر روز اک نیا غم ہے

رات مت پوچھ کہ تجھ بن جو مصیبت گزری

صبح تک ہجران عجب دل پہ قیامت گزری
عشق میں اس مہ بے مہر کے دیکھا بیدار
آہ کیا کیا نہ ترے جی پہ اذیت گزری

اتنا تو وہ نہیں ہے کہ بیدار دتجے دل
کیا جانے پیاری اس کی تجھے کیا ادا لگی[۱]

(۳) اُن کے کلام میں بہ حیثیت مجموعی ایک طرح کی رنگینی و شادابی پائی جاتی ہے جو کم از کم میر اور درد کے ہاں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ یہ خوبی زیادہ قابل قدر اس لئے ہے کہ بعض جگہ مضامین کے اعتبار سے ایسی رنگینی پیدا کرنا محال نظر آتا ہے۔ یہ بات کچھ تو لطیف و نادر تشبیہات سے پیدا ہوئی ہے اور کچھ عام اسلوبِ ادا و رنگِ طبیعت کی وجہ سے مثلاً ؎

گرچہ دل کش ہے دل ربا کی ادا
پر نکیلی ہے تری بانکی ادا

کھپ گئی جی میں اس جواں کی ادا
بل بے تیکھی نگاہ بانکی ادا

خندۂ گل میں کب ہے اتنا لطف
جو ہے ہنسنے میں اس دہاں کی ادا

---

[۱] سودا کا مقطع مشہور ہے ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

لیکن انصاف شرط ہے، بیدار کا شعر بھی کسی طرح اس سے کم درجہ پر نہیں رکھ سکتے۔

باتوں باتوں میں دل لیا بیدار
دیکھی اس میرے دل ستاں کی ادا

چھوٹ کر چشم سے دل تیری زنخداں میں گرا
مست میخانہ سے جا چشمۂ حیواں میں گرا!!

مصرعۂ قد کا ترے مصرعۂ ثانی نہ ہوا
سرو ہرچند کہ برجستہ و خوش موزوں تھا

گیا درسِ کتب مدت سے یادِ چشم ساقی میں
مگر پڑھنے میں آتا ہے کبھو دیوان جامی کا

بیدار پیجے اس شبِ مہتاب میں شراب
ہے دستِ سرخ یار میں مینائے آفتاب

یاد میں اس قد و رخسار کی اے غم زدگاں
جا کے ٹک باغ میں سیر گل و شمشاد کرو

کیا ہی اب کی دھوم سے اے میکشاں آئی بہار

ساغرِ گل میں شرابِ ارغواں لائی بہار!

طاقت نہیں ہے صبر کی اس ابر میں مجھے
ساقی شتاب بادۂ گل گوں سے بھر ایاغ!

چاہ کا تجھ کو مرے دل پہ گماں ہے کہ نہیں
بوئے گل دیکھ تو غنچہ میں نہاں ہے کہ نہیں

ماہ رخسار، ہلال ابرو و خورشید جبیں
شمع روشن کن کاشانۂ اربابِ یقیں
گل بدن، غنچہ دہن، سرو قد و نرگس چشم
یعنی سر تا بہ قدم باغ و بہارِ رنگیں
مست و بے باک و غزل خوان و پریشاں کاکل
بزم میں آ کے بصد ناز ہوا صدر نشیں
دیکھ کر چاہے کہ تصویر کو کھینچے اس کی
نقشِ دیوار ہو صورت گرِ بت خانۂ چیں
جا کے بیمار کو دیکھا تو عجب حالت ہے
دل ہے افگار جگر خستہ و جاں ہی غمگیں
شدتِ درد و الم سے ہے نہایت بے تاب

چشمِ خوں بار سے تر ہیں در و دیوار و زمیں!

صفا الماس و گوہر سے فزوں ہے تیرے دنداں کی
کہاں تجھ لب کے آگے قدر و قیمت لعل و مرجاں کی

اس کے عارض پہ ہے عرق کی بوند
یا کہ بیدار گل پہ شبنم ہے

لب رنگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی
زیب دیتی ہے تجھے نامِ خدا کم سخنی

کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے
بلبلِ زار سے ممکن ہے کہ بستاں چھوٹے؟

ساقی نہیں ہے ساغرِ مے کی طلب ہمیں
آنکھیں ہی تیری دیکھ کے بے ہوش ہو گئے

عجب مزہ ہے کہ پیتے ہیں نونہالِ چمن
سبوئے غنچہ سے بھر کے ایاغ میں گل کے

عیاں ہے شکل تری یوں ہمارے سینے سے
کہ جوں شراب نمایاں ہو آبگینہ سے
گیا ہے جب سے تو، ویراں ہے گھر مرے دل کا
کہ زیب خانۂ خاتم کو ہے نگینہ سے

(۴) اور لطیف و رنگین تشبیہات کے پردے میں اور اپنے رنگ طبیعت کی وجہ سے وہ کہیں کہیں ایسے دقیق مسائل اور وسیع خیالات نظم کر جاتے ہیں جن کی تشریح و تحلیل کے لئے دفتر چاہئیں۔ اس حیثیت سے ان کے معاصرین میں سے بہ استثنائے میرؔ دوسرے شعرا شاید اُن کے مقابل مشکل سے لائے جاسکتے ہیں، مثلاً ؎

ہر ایک ذرہ میں یوں جلوہ گر ہے وہ خورشید
کہ جس طرح سے ہے موج و حباب میں دریا

ہم تو ہر شکل میں یاں آئینہ خانہ کی مثال
آپ ہی آتے ہیں نظر سیر جدھر کرتے ہیں

جذب تیرا ہی اگر کھینچے تو پہونچیں ورنہ
تجھ کو سنتے ہیں پرے واں سے جہاں جاتے ہیں

ہمکو منظور نہیں سیر و تماشا سے کچھ اور — دید تیری ہی ہے منظور جدھر جاتے ہیں

باپ کا ہے فخر وہ بیٹا کہ رکھتا ہو کمال
دیکھ آئینہ کو فرزند رشید سنگ ہے
یہ صدا گھر گھر کرے ہے آسیا پھر پھر مدام
مشتِ گندم کے لئے چھاتی کے اوپر سنگ ہے

آمد و رفتِ سبک روحاں سے کون آگاہ ہے
شمع سے کس نے سنی آوازِ پا رفتار کی

غیبت ہی میں ہے اس کی ہمارا ظہور یاں
وہ جلوہ گر جب آکے ہوا ہم کہاں رہے
مثلِ نگاہ گھر سے نہ باہر قدم رکھا
پھر آئے ہر طرف یہ جہاں کے تہاں رہے

اور اسی طرح اُن کے دیوان میں تلاش سے کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں کوئی ایسا مفرد، قائم بالذات مضمون نظم کیا گیا ہو جسے آج کل کی زبان میں "فلسفیانہ شاعری" کہئے۔ اُردو شاعری میں اس قسم کے اشعار لے دے کے چند ہی قسم کے مضامین تک محدود ہیں مثلاً دنیا کی سفلہ پروری، گردش روزگار، صبر و قناعت، گوشہ نشینی، اخلاق و موعظت وغیرہ لیکن میری مراد یہاں ایسے مضامین سے ہے جن میں دنیا یا زمانہ کے متعلق کوئی اہم حقیقت، کوئی اٹل صداقت بیان کی گئی ہو،

حیات کے کسی ایک رخ کی تفسیر، زندگی سے متعلق کوئی ایسا اہم نکتہ، کوئی راز جس کی کھٹک سے انسانی دل بے چین ہو اور وہ شعر یا مضمون اُس بے چینی کی خلشوں کو مٹائے، یا کم از کم انسان کو اس مسئلہ پر غور انگیزی ہی کا موقع بخشے۔ ایسے مضامین سے ہمارے قدیم شعرا کے دیوان خالی ہیں اور یہ فلسفۂ حیات کی تفسیر جدید شاعری کا موضوع ہے جس کی ابتدا غالب سے ہوئی ہے۔ بیدار کے ہاں بعض ایسی صداقتیں ایسی خوبی سے نظم ہو گئی ہیں کہ شاعر کے حق میں دعائے خیر کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ کلام ڈیڑھ دو سو برس کا ہے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اس قبیل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اعتقادِ مومن و کافر ہے رہبر ورنہ پھر
کچھ نہیں دیر و حرم میں خاک ہے یا سنگ ہے

بانگِ گل باعثِ گردن شکنی ہے گل کی
غنچہ سالم ہے کہ جب تک اُسے خاموشی ہے[1]

---

[1] اس شعر کا علامہ اقبال کے اس شعر سے مقابلہ کیجئے :-

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت — اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

اس "لبِ گویا" کی تفسیر کے لئے ایک دفتر چاہیئے مگر "محسوسات" کو الفاظ میں قید کرنا گویا ان کی وسعت کو محدود کرنا ہے، اس لئے بقول حضرت اصغر، ع "خاموش ہوں کہ معنیٔ صد ہا ہیں خامشی کے"

سمجھتا ہے اسی کا جلوہ گہِ غیب شہادت کو
نہیں کچھ فرق عارف کو سفیدی اور سیاہی میں
جگا کر خوابِ آسایش سے بیدارؔ آہ ہستی میں
عدم آسودگاں کو لا کے ڈالا ہے تباہی میں

ہے بہارِ رنگ و بوئے تازہ روئے خصم جاں
سالم آفاتِ سماوی سے گلِ پژمردہ ہے

(۵) کہیں کہیں لطیف اور سنجیدہ قسم کی ظرافت کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو بیدارؔ کے ہم عصروں میں بہ استثنائے سوداؔ جن پر ہجو گوئی کا کمال ختم ہو گیا کمیاب ہیں۔ اُردو شاعری میں ابتدا ہی سے "طنزیات" کے معنی بیہودہ مذاق اور پھکڑ کے سمجھے گئے ہیں اور شیخ اور زاہد کی جانیں اُن سے ابد تک محفوظ نظر نہیں آتیں۔ یہ موضوع اس قدر فرسودہ ہو گیا ہے کہ اب اس کے ذکر سے بھی اذیت ہوتی ہے لیکن بیدارؔ کے ہاں یہ مذاق ایسا معتدل رنگ لئے ہے جس سے طبیعت کو انقباض اور تنفر کے بجائے ہلکا ہلکا سرور و کیف حاصل ہوتا ہے مثلاً ؎

شورِ سودائے جنوں سے مرے اب کی بیدارؔ
جز معلّم نہ کوئی طفل دبستاں میں رہا

وجدِ اہلِ کمال ہے کچھ اور　　　شیخ صاحب کا حال ہے کچھ اور

فخرِ انساں نہیں ملک ہونا   جی میں اپنے خیال ہی کچھ اور

اے شیخ تو اس بُت کے کوچہ میں تو جاتا ہے
ہو جائے نہ یہ سبحہ، زنار، خدا حافظ!

نہ کر مستوں سے کاوش ہر گھڑی آمان کہتا ہوں
خلل آجائے گا زاہد تری عصمت پناہی میں

خرقہ رہنِ شراب کرتا ہوں   دلِ زاہد کباب کرتا ہوں

کیا ہے تنگ مجھے سخت ناصحوں نے یہاں
جو تو ہو آکے نمایاں تو کیا تماشا ہو

زاہد اس راہ نہ آ مست ہیں میخوار کئی
ابھی یاں چھین لئے جبہ و دستار کئی

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں اپنا
کہ ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

(۶) بایں ہمہ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بیدار کے کلام میں کمزوریاں

نہیں ہیں اور ان کا دیوان شروع سے آخر تک اسی طرح کے ہموار اور انتخابی اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ بیدار کے دیوان میں ایہام، رعایتِ لفظی، عامیانہ جذبات نگاری اور بے مزہ اشعار کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور چاہیئے تو یہ تھا کہ بطور "مشتے نمونہ از خروارے" وہ بھی یہاں پیش کی جاتیں لیکن اس قسم کے اشعار کم ہیں اور انہیں نقل کرنا بیکار ہے، ایسا کر کے میں اس مضمون کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔ ناظرین کو اصل دیوان میں یہ چیزیں ضرور ملیں گی۔ اس معاملہ میں اُن کی مثال دردؔ کے خلاف میرؔ کی ہے جن کے ہاں پست و بلند ہر طرح کے اشعار موجود ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ کے متعلق آزردہ کا جو یہ قول ہے کہ "پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند" وہ ایک حد تک یہاں بھی صادق آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ بیدارؔ کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ اُردو شاعری کی ابتدا تھی، ایک طرف تو پیش رو قدما شاہ مبارک آبروؔ وغیرہ کے خصوصیاتِ شاعری اور اُن کے اثرات پورے طور پر نہ صرف دل و دماغ سے محو نہ ہوئے تھے بلکہ نومشق شعرا کے لئے آئیڈیل کا کام کرتے تھے اور بطور کلاسیکل شاعری کے پیشِ نظر تھے۔ یہاں تک کہ میر تقی میرؔ جیسا شاعر اپنے تذکرہ میں اس زمانہ کے مذاق کے نمایندہ اشعار میں اس قسم کے شعر بھی پیش کرنے کے لئے مجبور تھا۔

خط کترواکے آج قینچی سے　　ہم سے ملنے میں جلائے ہے کترا

شیخ جو حج کو چلا چڑھ کے گدھے پر یارو

زور نہیں ظلم نہیں عقل کی کوتاہی ہے

دوسری طرف مرزا مظہرؔ، میرؔ، دردؔ اور سوداؔ جیسے مصلحین اور مجتہدین فن کی کوششیں صرف آغاز ہوئی تھیں اور اپنا پورا اثر ظاہر نہ کر پائی تھیں۔ بیدارؔ بھی اُسی زنجیر کی ایک کڑی تھے۔ ایک نیم پختہ تنگ اور خاردار راستہ کو خس و خاشاک سے پاک کرنا اور کانٹوں کے بجائے وہاں گل بوٹے اُگانا، اُسے وسعت و پختگی بخش کر خوبصورت سایہ دار پودوں سے اُس کے اطراف کو مزین کرنا دشوار کام ہے جس کے لئے ایک مدّت درکار ہے۔ کسی جماعت کے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور محدود کیوں نہ ہو، رجحانات و میلانات کے بہاؤ کا رُخ ایک دن میں نہیں پھیرا جا سکتا، ایک فرد کے میلانات کا رُخ نہیں پھیرا جا سکتا، یہاں تک کہ خود ایک مصلح، ایک لیڈر جو ایک خاص ماحول میں پلا اور بڑھا ہو اُن اثرات سے جنھیں وہ زائل کرنا اور کرانا چاہتا ہے اک دم سے اپنے کو مامون اور محفوظ نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ اس کا مایۂ خمیر ہیں اور اُسے وراثتاً اپنے پیشروؤں سے ملے ہیں۔ اس لئے ہم بیدارؔ کو معذور سمجھتے ہیں اور انھیں اُن کی کمزوریوں کے لئے معاف کر سکتے ہیں، خصوصاً جب کہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اُن کے کلام کا بہت بڑا حصّہ ایسے رنگ کا سرمایہ دار ہے جس

ہیں حقیقی شاعری کی روح موجود ہے اور جو اپنی دل کشی اور مرغوبی کی وجہ سے اُن کے نام اور کام کو بقائے دوام بخش سکتا ہے۔ اور یہ یاد رکھئے کہ ہم اُن قدیم محترم بزرگوں کو آج کے معیارِ مذاق سے جانچ کر اُن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، اس کے لئے ہمیں اسی زمانہ کے مذاق کا جامہ پہن کر اُن کے حضور میں جانا ہوگا۔

بیدار اور کلام بیدار کی نسبت جو کچھ مجھے لکھنا تھا میں لکھ چکا اور جو رائے آپ کو قائم کرنی تھی آپ قائم کر چکے۔ اب ذرا انصاف کیجئے کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ایسے باکمال شاعر کے حالات اور اس کی شاعرانہ عظمت سے نقادانِ اَدب قطعاً ناواقف رہے اور اس کے کمال کی کسی تذکرہ نویس نے اس کے استحقاق کے موافق داد نہیں دی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کلام کے انتخاب میں بھی انھوں نے بہت بخل اور بے پروائی سے کام لیا، میرؔ، قائمؔ اور شفیقؔ کے تذکروں میں صرف وہ ایک شعر ہے جو میں نے اپنے مضمون کے آغاز میں پیش کیا ہے اور جیسا کہ میں نے دکھایا ہے وہ بھی غلط۔ میر حسنؔ کے تذکرہ میں تین شعر ہیں، شعر الہند میں چودہ، نسّاخؔ کے ہاں سترہ۔ صرف مولوی عبدالحیٔ نے تیئیس شعر دیئے ہیں اور مرزا علی لطفؔ نے بھی بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور اٹھتّر شعر انتخاب کئے ہیں، کم و بیش ان سب تذکروں میں وہ غلط شعر بھی بجنسہ موجود ہے۔ رہے حالات زندگی سو اُس کی توقع قدیم تذکرہ نویسوں سے فضول ہے۔

زمانہ کی بے مہری کی کیا شکایت کی جائے، معلوم نہیں کیسے کیسے باکمال اس نے پیدا کئے جو آج گوشۂ گم نامی میں زیرِ خاک پڑے آسودۂ خواب ہیں اور کوئی اُن کا نام بھی نہیں جانتا۔ بیدارا اپنے زمانہ کے اُن شعراء میں سے تھے جو سستے اور معمولی نہ تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈیڑھ دو سو برس کا زمانہ گزر جانے پر بھی ہم اُن کا کلام پڑھ کے انھیں سستا اور معمولی نہیں سمجھتے۔ مگر آج کون ہے جو اُن کی زندگی کی دو باتیں ہمیں سُنائے اور اُن کی مجلسوں کے مرقعے اور ان کی ہما ہمی کے نقشے ہمارے سامنے لائے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آبِ حیات" میں اس محرومی کا بڑا الم ناک رونا رویا ہے "میرے دوستو! زندگی کے معنے کھانا، پینا، چلنا پھرنا، سو رہنا اور منھ سے بولے جانا نہیں ہے۔ زندگی کے معنے یہ ہیں کہ صفاتِ خاص کے ساتھ نام کو شہرت عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہونچائیں، انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گراں بار احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر اُن کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا، مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائیں گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت

غمناک حادثہ ہے[1]"...... مگر میں خوش ہوں کہ میر محمدی بیدار کا کمال شاعری نہیں مرسکا کیونکہ اتنے عرصہ گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے کے بعد آخر دیوان بیدار کی طباعت و اشاعت کا کام ایک باہمت اور غیور ادارے، ہندستانی اکیڈیمی، صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ نے اپنے ذمّہ لیا ہے اور اگرچہ اس کی ترتیب و مقابلہ کا کام اور اس پر مقدمہ لکھنے کا فرض مجھ ناچیز کو سونپا گیا ہے جو اپنی کوتاہیوں سے واقف ہے اور جس کی خامیوں سے کتاب کا معنوی پلّہ ہلکا ہونے کا اندیشہ ہے پورا یقین ہے کہ اس کمی کی تلافی اکیڈیمی کے حُسن طباعت و خوش سلیقگی سے ہوجائیگی اور دیوان بیدار کا ایک ایسا عمدہ اور دیدہ زیب نسخہ ناظرین کو ہاتھ آجائے گا جیسا شاعر کی زندگی میں بھی ممکن نہ تھا اور اس کے کمال پر نظر رکھتے ہوئے جو گویا اس کا حق تھا۔

میں نے یہ دیوان اپنے اور مولوی احسؔن مارہروی صاحب کے نسخے سے مقابلہ کرکے تیار کیا ہے، اگرچہ میں نے اور میری فرمائش پر اکیڈیمی نے ان حضرات کو جن کے پاس دیوان بیدار کے نسخے موجود تھے خطوط لکھے مگر کسی بزرگ نے اس کار خیر میں میری مدد کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس لئے مجھے ان حضرات کا شکوہ اور احسؔن صاحب کا شکریہ عرض کرنا ہے۔ احسؔن صاحب کا نسخہ ناقص و نامکمل ہے اور کسی حد تک زیادہ

---

[1] دیباچہ آب حیات، صفحہ ۳،

پُرانا معلوم ہوتا ہے اور اس کا کاتب بھی بہت بد خط ہے تاہم مقابلہ فائدہ سے خالی نہیں رہا۔ اس سے ایک پوری غزل نئی ملی اور اشعار تو بہت سے ملے۔ بعض جگہ دونوں نسخوں کے متن میں اختلاف تھا۔ ایسے موقعوں پر میں نے شاعر کے زمانے کی زبان کا خیال رکھا ہے اور اپنی محدود بصیرت کے مطابق جو صورت بہتر اور زیادہ صحیح معلوم ہوئی اُسے متن میں قائم رکھا ہے۔ ہاں اختلاف ظاہر کرنے کو دوسری صورت حاشیہ پر دکھا دی ہے۔ جہاں کہیں کتابت کی غلطیاں تھیں وہاں بھی اپنے عقل و ذوق کو راہ دی ہے۔ یہ ظاہر کرنے سے مطلب یہ ہے کہ دیوان کے اس قسم کی خامیوں کی ذمہ داری شاعر پر نہیں مجھ ناچیز پر ہے۔ خدا کرے یہ دیوان اہل ذوق میں مقبول ہو۔

اب میں اپنے اس مضمون کو بیدار کے دیوان سے ایک یہ آخری "سادہ پُر کار" غزل نقل کر کے ختم کرتا ہوں ؎

میر مجلسِ رنداں آج وہ شرابی ہے
خونِ دل جسے میرا بادۂ گلابی ہے
عیش چاہیئے جو کچھ سو تو آج ہے موجود
جام ہے، ہے، ساقی ہے سیر ماہتابی ہے
صبح ہونے دے ٹک تو رات ہے ابھی باقی
تجھ کو گھر کے جانے کی ایسی کیا شتابی ہے

ہم ہیں اور تم ہو یاں، غیر تو نہیں کوئی
آ گلے سے لگ جاؤ وقت بے حجابی ہے

چشم کو ہے بے خوابی دل کو سخت بیتابی
ہجر میں ترے ظالم یہ یہ کچھ خرابی ہے

کیوں نہ بزم میں بیدار ہوئے قابلِ تحسین
ہر یک اس غزل کے بیچ شعر انتخابی ہے

منتخباتِ مشتاق

یہ تیس صفحے کا ایک مختصر رسالہ ہے، مدرسہ کی کاپیوں کے سائز پر، کاغذ بادامی رنگ کا، دبیز پرانا۔ اس میں چھوٹی بڑی پینتالیس غزلیں ہیں۔ آخر میں بتیس متفرق مطلعے اور اشعار اور گیارہ رباعیاں بھی درج ہیں۔ ان میں سے ایک غزل اور ایک رباعی فارسی کی ہے۔ غزلوں کی ترتیب قدیم روش کے خلاف ردیف وار نہیں ہے لیکن کس اصول کے ماتحت ہے یہ بھی نہیں معلوم، یہ کتاب مجھے کئی سال اُدھر دستیاب ہوئی تھی۔ نبی بخش کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ کتابت کب ہوئی یہ کچھ نہیں لکھا ہے۔ کاتب کے الفاظ یہ ہیں:۔

" تمام شد رباعیات و مطلع ہا و غزل ہائے مشتاق بروز سہ شنبہ بخط نبی بخش صورت انجام پذیرفت۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

لہ یہ نسخہ اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

نوشتہ نماند بخط غریب   کہ نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب"

اس ستم ظریفی کی داد دیجئے کہ سب کچھ لکھ گئے مگر کام کی کوئی بات نہ لکھی۔ میں نے بہت تلاش اور جستجو سے کام لیا۔ لیکن شاعر کا نام اور اس کے حالات نہیں معلوم ہوئے۔ مشتاق تخلص کے شعرا کا حال پیش نظر تذکروں میں بہت کم ملتا ہے۔ صرف نسّاخ اور شیفتہ کے تذکروں میں اس تخلص کے شعرا کا ذکر ہے۔ اوّل الذکر میں اس تخلص کے تیرہ اور موخر الذکر کے تذکرہ میں تین شاعر ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُن تذکروں کے انتخابات شعر میں منتخبات مشتاق کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ دونوں متذکرہ بالا تذکروں میں مشتاق تخلص کے شاعر مختلف نام کے ہیں۔ صرف تاج الدین نامی شاعر متوطن میرٹھ دونوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کا یہ ایک شعر ملتا ہے ؎

کوہ کن اور پرویز کو قصّہ اپنا اپنا سنانے دو

یہ ہے وہ افسانۂ شیریں ایک پری دیوانے دو

دیوانِ بیدار[۱] کی ترتیب اور مقابلہ کے سلسلہ میں اس کا جو نسخہ مولوی احسنؔ مارہروی صاحب نے مجھے عنایت کیا ہے اس کے آخر میں چند صفحات پر متفرق اشعار مختلف شعرا کے درج ہیں ان میں ایک غزل من تصنیف محمد تاج الدین دہلوی متخلص بہ مشتاق کی

---

[۱] ملاحظہ ہو اس مجموعہ کا پہلا مضمون۔

بھی ہے۔ مشہور طرح ہے جس میں جرأت کی یہ غزل شہرت پا چکی ہے۔

چتوں میں لگاوٹ سین غضب مژگاں کی جھپک پھر ویسی ہے

مگر یہ وطنیت کے اختلاف کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ علاوہ اس کے میرے پیش نظر نسخہ کا مصنف ایسا شوخ اور بے باک شاعر نہیں ہے جیسا یہ دہلوی شاعر۔ بہرحال جب تک مزید حالات نہ معلوم ہو سکیں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس انتخاب کے متعلق دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا کوئی شعر پیش نظر تذکروں میں نہیں ملتا جس کی وجہ سے شاعر کے نام اور اس کے زمانہ کا تعین کرنا اور اس کے حالات معلوم کرنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ جب یہ انتخاب ہمارے سامنے ہے تو ضرور ہے کہ شاعر صاحبِ دیوان ہے۔ جس کے کلام کا یا تو خود کاتب نے یا کسی شائق شعر نے یہ انتخاب کیا ہے۔ اک ذرا سا شبہ اور ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ شاعر نے اُردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہے ہیں جیسا کہ پرانے شعرا کا اور کچھ دنوں پہلے تک جب کہ فارسی کا اثر کم نہیں ہوا تھا عام دستور تھا کیونکہ اس رسالہ میں ایک فارسی غزل اور رباعی بھی شامل ہے۔ بہرحال یہ صرف قیاسات ہیں اور حالات کی عدم واقفیت میں یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ جس قدر قومی قیاسات سے ہو سکے کام لیا جائے۔

منتخبات مشتاق کے مطالعہ کے بعد اس کی اندرونی شہادتوں

کی بنا پر ہمیں ذیل کی باتیں معلوم ہوئی ہیں

(الف) مشتاق اُردو کے ابتدائی دور کے شاعروں میں سے ہیں جبکہ زبان صاف اور رواں نہیں ہو پائی تھی، اور شعر کی فصاحت وغیرہ کے متعلق قواعد منضبط نہیں ہوئے تھے - غالب گمان یہ ہے کہ میرؔ و سوداؔ اور دردؔ وغیرہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں - ان باتوں کا ثبوت، حسب ذیل امور سے مل سکتا ہے :-

(۱) نپٹ، بہ تنگ، نت، سداں، جو ہیں، وو ہیں، کے قسم کے الفاظ کا استعمال مثلاً ؎

کچھ آج بیکلی ہے نپٹ انتظار ہے ۔۔۔ جلدی سے آن مل کہ یہ دل بیقرار ہے
آیا ہے اب بہ تنگ نپٹ غم سے جی مرا ۔۔۔ لالہ کی طرح آہ دل بے قرار ہے
احوال بس کہ درد جدائی سے ہے تباہ ۔۔۔ دریائے خون چشم سے نت آشکار ہے

سداں اس دیدۂ غمناک سے گوہر فشانی ہے ۔۔۔ ہمارے حال پر اے وائے کیا نامہربانی ہے

ہوکے حیرت زدہ بس اُٹھ ہی گیا رو کے طبیب ۔۔۔ پارسینہ کے جوں ہی تیر کا پیکاں دیکھا

میں نے جو اپنے دیدۂ گریاں دکھا دیئے ۔۔۔ اوسان اُڑ گئے وو ہیں ابر بہار کے

(۲) اُن نے، ہے گا، منہ لپسارنا، دید کرنا، فہمید، طپیدہ وغیرہ کا استعمال، مثلاً ؎

سُنا ہے اُن نے احوال پریشاں کو مرے جب سے
پٹک کر سر کو پروانہ کف افسوس ملتا ہے

یار تو بس کہ خوش ادا ہے گا　　دل بیمار کی دوا ہے گا

منہ کیا پسارتا ہے اس کی طرف کو گل گیر　　تقصیر تو نے دیکھی کیا شمع بے زبان کی

غافل کبھی نہ ہوگا پھر خواب میں میسّر　　آتا ہے دید کرنے اس گلشن جہاں کی

ناداں تو ڈھونڈھ آپ میں کیا تجھ سے دور ہے　　فہمید کا تری تو یہاں بس قصور ہے

وہ یار بعد مرے بر سر مزار آیا　　طپیدہ دل شیدا کو اب قرار آیا

(۳) انتظار کا استعمال منتظر اور گذار کا استعمال گذر کے معنوں میں مثلاً ؎

باد صبا گذر جو ترا ہو بہ کوئے یار　　کہیو کہ اب تلک وہ ترا انتظار ہے
وہ رشکِ گل نظر سے تو کب کا گذر گیا　　اے چشم کس کے واسطے تو انتظار ہے

جا کیجیو تو اس دل بے رحم میں اثر　　آہِ سحر ترا جو وہاں تک گذار ہو

(۴) الفاظ کی تذکیر و تانیث میں کسی خاص احتیاط کا پابند نہ ہونا۔ مثلاً ؎

چین ہرگز نہ ہوگی اس کو کبھی — جس کا دل یار سے لگا ہے گا

اے صنم جاں لبوں پہ آپہونچا — آج جاتا ہے یہ ترا بیمار

کچھ جان مری بیکل آپی ہوئی جاتی ہے — آرام کسی پہلو اس دل کو نہ آتی ہے

(۵) قافیہ کے انتخاب میں قواعد مقررہ سے آزاد نظر آنا۔ مثلاً جس غزل کا مطلع اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے ع

سایہ کے سوا ہرگز اور کوئی نہ ساتھی ہے

(۶) فارسی اشعار خیالات اور اقوال کو اُردو میں منتقل کرنا یا احادیث کا ترجمہ کرنا' یا فارسی تراکیب اور اُن کے انداز بیان کی تقلید جو اس دور کا خاص انداز ہے، مثلاً سہ

صحرا میں تو ہر طائر ہو وحشیٔ رم خوردہ — ہونے کو شکار اس کے ہر ایک جدا نکلا

اس شعر کا خیال امیر خسرو کے اس شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے سہ

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف — بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

یا

کہہ تو رستم سے کہ سر کو کھو سکے — کام جس کا ہو اسی سے ہو سکے[1]

اس شعر میں فارسی مثل "ہر کارے و ہر مردے" یا "ہر کسے را

---

[1] سودا سہ

تجھ تیغ تلے کہہ تو رستم سے کہ سر دھر دے — پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

بہر کارے ساختند» کھپائی گئی ہے۔

یا

بے کلی سے اس قدر تڑپا کیا　　رات ہمسایہ نہ ہرگز سو سکے[1]

یہ شعر خاقانی کے ذیل کے شعر سے متاثر معلوم ہوتا ہے ؎

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت　　خاقانی را دگر شب آمد

یا

مزرع عقبیٰ ہے یہ دنیا صنم　　تخم نیکی بو اگر چہ بو سکے

اس شعر میں مشہور حدیث " الدنیا مزرع الاخرۃ" کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ذیل کے اشعار میں بھی کچھ نہ کچھ فارسی انداز کا پرتو نظر آتا ہے ؎

اے ہم نفساں دل کو جو ڈھونڈو ہو مرے پاس
دل جا کے مرا دیکھو تو در کوئے بتاں ہے

جو دم ہے زندگی کا سو دل پر غبار ہے　　یہ دل نہیں ہے دشمن جاں در کنار ہے

مدام آتش ہجراں سے یہ دل بیتاب　　برنگ قبلہ نما سوئے یار رہتا ہے

---

[1] میر حسن ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ　　بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

واشد کی آرزو ہی رہی تجھ سے اے نسیم	باغِ جہاں میں دل یہ مرا غنچہ وا رہے

(۷) اس کے علاوہ سودا اور درد وغیرہ کے اشعار کو کہیں کہیں اپنے اشعار میں ضم بھی کیا ہے۔ درد کے رنگ تصوّف سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تقلید کی بھی کوشش کرتے ہیں، مثلاً ؎

عجب احوال ہے میرا بقول مصرعۂ سودا	کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اسی کو سرگرانی ہے

مشتاق حسبِ حال ہی سودا کا یہ کلام	ہر سبزہ نو دمیدہ ہمیں نوک خار ہے

مشتاق جی بہ تنگ ہے اب تو بقول درد	اب اُٹھئے اس جہاں سے کہ سب یار سو گئے

مرتبہ کو کون اس کے پا سکے	کب خیال عقل اُس جا جا سکے
شوق میں بیخود ہوئے ایسے کہ ہم	پھر بخود چاہا نہ ہرگز آ سکے
تاب ہی جس میں نہ ہو ہلنے کی آہ	زخمِ دل وہ کس طرح دکھلا سکے
اُس شہِ خوباں کو میرا یہ پیام	ق اے صبا لے جا جو تو لے جا سکے
جی زبس ہے دردِ غم سے بیقرار	دخل کیا اس کو کوئی سمجھا سکے

عشق کی منزل ہے اے مشتاق دور
شوق ہاں اس کا اگر پہونچا سکے

(ب) مشتاق کے کلام کے مطالعہ سے کسی حد تک اُن کے مذہبی عقائد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ گو یقین کے ساتھ یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ مشتاق اہل تشیع میں سے تھے یا اہل سنت والجماعتہ اس لئے کہ اس زمانہ میں مذہبی رواداری عام تھی۔ اور موجودہ دور کی نام نہاد تہذیب نے سماج کے اخلاق کو پست نہیں کیا تھا۔ تاہم اُن کے ذیل کے اشعار قابل غور ہیں ؎

عبث کیوں دردو غم میں اس قدر تو مبتلا ہے گا
تری مشکل کشائی کو علیِ مصطفٰے ہے گا
چھوڑایا شیر سے سلماں کو اس نے دشت میں آ کر
علی کا نام اے دل دافع رنج و بلا ہے گا

مشتاق میں تو ہوں زغلامان پنجتن بیشک خدا کا نور اور وہ ایک نور ہے

افسوس ہے اس سے زیادہ مشتاق کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا زمانہ تھا اور کیسے بے نیاز، مستغنی اور سادہ دل لوگ تھے جن میں نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا" زندگی میں رہی، نہ نام ونمود کی خواہش مرنے کے بعد۔ زندگی میں شاعر نے اپنے لئے کہا تھا ؎

گو چار دن کی زیست میں خاموش لب ہے مشتاق یہ سخن ہی ترا یادگار ہے

لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس کا سخن بھی یادگار نہ رہے گا۔ معلوم نہیں اتنی دیر تک اس کا کلام کس گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا اور اب ملا بھی تو مجھ جیسے کم علم شخص کو جس کا یہ چند سطریں لکھنا بھی نہ لکھنے کے برابر ہے کہ اُن کا نہ سر ہے نہ پیر اور نہ اُن سے کوئی مفید نتیجہ مرتب

ہو سکتا ہے۔ بس ایک اُمید ہے، شاید اس مضمون کو پڑھ کر کوئی صاحب شاعر اور اس کے کلام کے متعلق مزید معلومات فراہم کر سکیں

اس میں شک نہیں کہ مشتاق کا کلام نہایت پاکیزہ، شستہ اور پُر تاثیر ہے جس میں ایک اُستادانہ شان پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں صفائی، روانی اور برجستگی بلا کی ہے۔ سوز و اثر، سادگی اور ایک طرح کا بھولا پن جو قدما کے کلام کا خاص وصف اور امتیاز ہے سارے کلام میں موجود ہے۔ ذیل میں ہم اس انتخاب کا ایک انتخاب ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ کم از کم اسی قدر کلام محفوظ رہ جائے اور وہ خود اندازہ کر سکیں کہ ہمارے مندرجۂ بالا بیانات کو مفرط ستائش نہیں کہا جا سکتا۔ اس کلام کو درحقیقت مشتاق کی شاعرانہ اُستادی اور باکمالی کی یادگار ہونا چاہیئے۔ جس کے لئے شاعر نے اپنی زندگی میں دُعا کی تھی اور جس پر ہم اس قدر دیر از وقت لیکن نہایت ہی مخلصانہ آمین کہتے ہیں ؎

طپش دل کے سوا اور سروکار نہیں — جلوۂ یار تو ہے دیدۂ ابصار نہیں
اے فلک کج روشی گو کہ تری ہے مشہور — یار کو ہم سے ملا دیوے تو دشوار نہیں

آتش ہجر سے مشتاق جگر جلتا ہے
چشم گریاں کے سوا کوئی مددگار نہیں

یار تو بس کہ خوش ادا ہے گا — دل بیمار کی دوا ہے گا
چین ہرگز نہ ہو گی اس کو کبھی — جس کا دل یار سے لگا ہے گا

اب تو طاقت نہیں جدائی کی صبر دل میں نہیں رہا ہے گا
نہیں ہے گا کسی شراب کے بیچ جو تری چشم میں نشا ہے گا
تیرا مشتاق ہوں میں اے مری جاں
کیوں عبث مجھ سے تو خفا ہے گا

سدا اس دیدۂ نمناک سے گوہر فشانی ہے ہمارے حال پر اے وائے کیا نامہربانی ہے
صدائے آہ کیا مذکور دل سے تا بہ لب آئے تری دوری سے اے آرام جاں یہ ناتوانی ہے
کہاں تک شکوۂ جور و جفا اس شوخ کا کیجے اسی درد و الم سے ایک دن تو جان جانی ہے
بس اب خاموش اے مشتاق شکوہ کیا قیامت ہے
فراق یار میں مرنا حیات جاودانی ہے

کوچۂ یار سے یوں بے سر و ساماں نکلے جاں بلب خستہ جگر یا دل نالاں نکلے
پیش قدمی کرے شمشاد چمن سے آکر سیر گلشن کو جو وہ مہر درخشاں نکلے
دیں خراج آکے یہ خوبان جہاں کے سارے جس گھڑی ناز سے وہ شوخ خراماں نکلے
طپش دل نے کیا کام ہی آخر مشتاق
زخم سینہ سے مرے شعلہ فروزاں نکلے

آہ جس دن سے تو جدا ہے یار آنکھ میں مثل خار ہے گل زار
شرح غم تاب کیا قلم سے لکھے جو گذرتی ہے مجھ پہ اے دل دار
ایک دم خضر آن بیٹھا تھا زیست سے اپنی ہو گیا بیزار
اشک سے سر زمیں تو سب ڈوبی کیا کیا تم نے دیدۂ خوں بار
کچھ علاج اس کا اب نہیں مشتاق

آہ تجھ بن تو عجب بھاتے ہے غم خوار کا رنگ | شمع نے جی ہی دیا دیکھ شب تار کا رنگ
کچھ خبر ہے تجھے اے ماہ جہاں جلوہ فروز | آتش ہجر سے پہونچا ہے یہ آزار کا رنگ
جو کہ آتا ہے عیادت کو وہ با دیدۂ تر | دیکھ رہ جاتا ہے منہ اس ترے غمخوار کا رنگ

وہ رشک چمن اس دم گلشن میں جو آ نکلا | بیساختہ ہر گل سے بس نام خدا نکلا
کچھ شور جنوں شاید ہے ملک عدم میں بھی | گلشن میں جو گل نکلا وہ چاک قبا نکلا
کیا آتش غم بھڑکی اعضا نہ کوئی چھوڑا | سینہ میں نہال غم اک تھا سو ہرا نکلا
اب دیکھئے کس کس کا پیغام صبا لائے | کچھ آج تو وہ قاتل بے طرح خفا نکلا
فرہاد بھی مجنوں بھی گو عاشق بے جاں تھے
مشتاق ترا پیارے ان سب سے جدا نکلا

مجلس میں آج دیکھا گردن جھکائے شیشہ | روتا ہے یاد کرکے صحبت کو میکشاں کی

اے پیر فلک وہ مہ کنعاں کہاں ہے | بن جس کے یہ گل زار جہاں مثل خزاں ہے
ہاں آتش ہجراں سے بجائے دل غمناک | اک آبلہ سینہ میں مرے ہی سو طپاں ہے

میں چاہتا تھا لکھوں حسب حال اے مشتاق | قلم تو صفحۂ کاغذ پہ زار زار رہا

لہ سراج اورنگ آبادی سے
چلی سمت غیب سے اک صبا کہ چمن امید وں کا جل گیا | مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی!

ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل — یہ کس جنجال میں جا کر پھنسا دل
کہا ہر چند کہنا ہی نہ مانا — ہوا آخر گرفتار بلا دل
لگا باتوں میں دے مجھکو بھلاوا — ابھی دھوکے میں مجھ سے لے گیا دل
صدائے آہ ہی کئی دن سے مسدود — کہیں سینہ سے شاید چل بسا دل ۱؎

دل ستم زدہ نے آج کیا ہی کام کیا — گلی میں شوخ کی جا آپ کو تمام کیا

برنگ ابر نیساں لگ گئیں اس چشم سے جھڑیاں — مثال در رکیتا کے گوندھی ہیں اشک کی لڑیاں

جس گھڑی اس مہ تاباں نے دکھائیں آنکھیں — سرنگوں ہو کے ستاروں نے چرائیں آنکھیں

افسوس کہ اس رشک قمر سے نہ ملے ہم — اس گردش افلاک سے مایوس چلے ہم

عرق آلودہ منہ ترا پیارے — دیکھتے ہیں فلک کے سب تارے ۲؎

۱؎ میر سے
شور بازار سے نہیں اٹھتا — رات کو میر مر گئے شاید

۲؎ سودا سے
آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو — اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

جو جور و جفا گزریں اس راہ میں سہ جانا
دل عشق کی منزل ہے ایسا نہ ہو رہ جانا
جی اُس مہ تاباں سے مشتاق ہے ملنے کا
اے چشم کہیں دیکھو رو رو کے نہ بہ جانا

(جامعہ، دہلی - جون ۱۹۳۴ء)

حسرت موہانی کی شاعری

جس طرح اردو شاعری میں استادِ سخن میرؔ کا مرتبہ مسلم ہے اسی طرح حسرتؔ موہانی کے اعجاز کا بھی کوئی اہلِ ذوق منکر نہیں ہو سکتا۔ وہ روح عالی جو قید جسم سے آزاد ہو کر آسمانی اور تخیلی فضاؤں میں محو پرواز ہوتی ہے، وہ نغمۂ لطیف جو ساز سے ماورا دل کی گہرائیوں اور جذبات کی تہوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے!

حسرتؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اُن کی شاعری عشق کی شاعری ہے اور جس طرح عشق اپنے ابتدائی درجات اور درمیانی منازل طے کرتا ہوا منتہائے اصلی تک پہونچتا ہے اسی طرح حسرتؔ کی شاعری عشق مجازی سے شروع ہو کر اُس کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر حاوی ہو کر، حُسن کے تخیلی پیکر کی تلاش میں آخر روحانیت، رضا جوئی حق، عشق ملّت اور حُبِ قوم پر ختم ہوتی ہے۔

حسرتؔ کے عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی، جوش اور شعلے

ہیں، اسی وجہ سے اُن کا ہر شعر سر تا پا اثر میں ڈوبا ہوتا ہے، زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے شام وسحر کی ہزار ہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں اور حسرت کا ترجمہ چاہے کسی زبان میں ہو اُن کے اشعار کی قدر وقیمت نہیں کم ہو سکتی ۔ اُن کی شاعری زمان ومقام کی قید سے آزاد ہے۔ حسرت انسانیت کے ترجمان ہیں، اُن لطیف وپاکیزہ احساسات کے ترجمان ہیں جو رہتی دنیا تک قائم ہیں۔ عشق کی زندگی گزار کر اپنی شاعری پر ایک پُر وجد اور والہانہ کیفیت طاری کر لینا حسرت کا کمال ہے۔ محبت کی کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ کیفیت ایسی نہیں جس سے حسرت ناواقف ہوں اور جس کی ترجمانی ایک سچے شاعر کی زبان میں اُنھوں نے نہ کی ہو۔ اس سلسلہ میں ایک دوست نے کیا پتہ کی بات کہی " حسرت کے پہلو میں اب دل کی جگہ تھوڑی سی راکھ ہوگی !"

حسرت کی شاعری کی ایک اور بڑی خوبی اُن کا انداز بیان ہے، اُن کی زبان شستہ، رفتہ اور اُن کا طرز بیان، رواں، شگفتہ اور خوش نما ہے۔ اُن کی نرالی ترکیبیں، اُن کے بولتے ہوئے فقرے اُن کے بانکے اور اچھوتے ٹکڑے ازبس پُر کیف اور وجد آور ہیں جو سننے والے کے دل میں تیر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔ حسرت کے کلام کی روانی، بے تکلفی، بانکپن، اور ان سب چیزوں کے امتزاج سے ایک خاص قسم کا لُطف اس درجہ دل پذیر ہے کہ ہر طبقہ او

ہر مذاق کے لوگوں میں مقبول ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعری کی پُرانی رسم کے مطابق حسرت کا جولان گاہِ شوق ایک محدود صنفِ شاعری یعنی غزل ہے اور انگریزی مذاق شعر سے متاثر و مرعوب احباب غزل کو کتنا ہی بُرا کہیں، اُس کی قیدوں اور بندشوں کو زبان اور ادب کے لئے کتنا ہی خطرناک خیال کریں کم ازکم اُس رنگ شاعری کے لئے جو حسرت کا ہے وہ غزل کی صنف کی پابندی ناگزیر ماننے پر مجبور ہوں گے۔ حافظ نے اسی محدود زمین پر مستانہ وار جادہ پیمائی کی اور اپنے عالم گیر پیام کو غزل میں دُنیا تک پہونچایا۔ سعدی نے جو پھول اس خشک اور بنجر زمین میں کھلائے اُن کی خوشبو سے مشامِ جان وتن اب تک معطّر ہے۔ غالب نے زندگی کی گتھیاں اور اسرار و معارف کی گرہیں غزل میں سُلجھائیں۔ جدید مشرق کے سب سے بڑے قوم پرست شاعر اقبال نے اپنے کلام کا ایک معتدبہ حصّہ غزلوں کے لئے وقف کیا۔ جو حکیمانہ نزاکت خیال اُن کی غزل کے ایک ایک شعر میں پائی جاتی ہے وہ اُن کی پُوری پُوری نظموں پر بھاری ہے۔ مغربی زبانوں میں غزل کے کمال کا اعتراف دیکھنا ہو تو جرمن شاعر گوئٹے اور انگریزی کے شاعر فلیکر کا کلام پڑھیئے۔

حسرت نے بھی اسی حقیر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی خوش بیانی اور خوش فکری سے دنیا کی مسرتوں اور آسائشوں میں اضافہ کیا ہے۔ جو لوگ غزل کی طرف سے اپنی سوءِ ظنی کا اظہار کرتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ اس میں پرانی اور سنی سنائی ہوئی چیزوں کے علاوہ نہ کچھ ہے اور نہ کچھ ہونے کی گنجایش وہ ذرا حسرت کی غزلیں دیکھیں اور تحیر و استعجاب سے کہیں "کیا ہے جو غزل میں نہیں" خود حسرت کہتے ہیں ؎

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ آئیے دیکھیں حسرت کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حسرت کی شاعری عشق کی شاعری ہے۔ آپ دیکھیں عشق کے تمام پہلوؤں پر حسرت کی نظر پہونچ گئی ہے یا نہیں۔ پہلا جلوہ ؎

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بیخبر خوبی پہ روئے یار کے پہلے پہل گئی

بے خبر پہلے مصرعہ کی جان ہے۔ پہلی نگاہ بغیر جانے ہوئے بلا کسی ارادہ کے بیخبر ہی پڑتی ہے، یا ؎

بھولے سے وہ اِدھر بھی جو آنکلے تھے کہیں اُس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

بھولے سے، بالکل ابتدائی درجہ ہے، بے خبری ثابت ہے ابھی اُن کا غیر ارادی طور پر "اِدھر آنکلنا" صرف "ماجرا" کی حد تک ہے۔ "یہ ماجرا" بار بار یاد آتا ہے "بھولتا ہی نہیں" ہے۔ وہ کون تھے یہ نہیں معلوم نہ عاشق نے پوچھا ؎

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُنکا جستجو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی

لیکن وہ جلوہ پیش نظر ہے ؎

بار بار آتا ہے یہ کس کا خیال — بے خودی بتلا مجھے کیا ہو گیا

اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند — آنکھوں سے مگر شوق تماشا نہیں جاتا

دل بہر حال کسی نہ کسی طرح محبوب کا سراغ لگا لیتا ہے ؎

کوچہ اُس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

اب محبت شروع ہوتی ہے۔ لیکن پیرایہ عجیب ہے ؎

نہ مجھکو اس کی خبر ہے نہ خود اُنہیں ہی خیال — کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے

یہ بے خبری دونوں طرف سے ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے لیکن غیر محسوس طریقہ پر محبّت نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اب واقفیت پیدا ہوتی ہے، ایک کا حال دوسرے پر روشن ہوتا ہے ؎

تقریب محبت کی کیا خوب تھی وہ ساعت — جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہ جبیں واقف

لیکن کیا دل فریب و پُر لطف زمانہ ہے، اُس طرف حجاب ہے اور تکلف ؎

نہ پوچھئے کہ ہوئی حُسن کی عجب حالت — سنی جو پہلے پہل عشق ناصبور کی بات

سُن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا — ہیں وہ بدنام کہیں ہم کو بھی رسوا نہ کریں

آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرم نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

عشق کی ناصبوری ؎

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں — اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

اس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے — دل میں گویا سما گئیں آنکھیں

جذبات صادق بالآخر رنگ لاتے ہیں ؎

آج سن کر میرے نالوں کو ز راہ التفات — زیر لب اس نے بھی کھینچی ایک آہ التفات

"آہ التفات" وہ بھی "زیر لب" کے لطف کو عشاق شادکام ہی سمجھ سکتے ہیں حسرت نے اس ابتدائی دور کے کیسے کیسے بامزہ اور پر کیف شعر نکالے ہیں ؎

یاد ہیں سارے وہ عیش با فراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسم جفا — اور مجھے حاصل تھے لطف بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں — یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں — التماس عذر و تمہید شکایت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار — جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

یہ اشعار غزل کے ہیں جو اپنی غیر مربوطی کے لئے بدنام ہے مگر اس قدر مسلسل و مربوط ہیں کہ مستقل نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔ پھر ان کی رنگینی و شگفتگی طرفہ عالم ایجاد کرتی ہے ؎

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا — باوجود حسن تو آگاہ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی — جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو ناز یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی — جب کہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق — ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبّت میں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری
غضب کی رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی
ہوئی ہے جن سے دامانِ محبّت پر یہ گل کاری

اب معاملات محبت کا ایک مستقل "کاروبار" شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار حسرت کے کلام میں بڑے جاندار اور سحر فن ہیں جن میں وصل و ہجر، شکوہ و شکریہ، نامہ و پیام اور حُسن و محبت کے نازک ترین تعلقات کا ذکر ہے۔ دیکھئے اور حیرت کیجئے کہ حسرت کی دوررس نظر کہاں کہاں پہونچتی ہے اور وہ معاملات محبت کے کیسے کیسے پہلو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

پہلے یہ مسلسل غزل لیجئے ؎

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات — بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے
خاطرِ محروم کو کر دیجئے محوِ الم — درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے
ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا — آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے — اب نہ ملئے پھر کبھی اور بیوفا ہو جائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال — آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں — یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اُس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے　　ترے اس طرز تغافل کے فدا ہو جائے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے اِن جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائے

اب یہ متفرق اشعار دیکھئے ؎

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا　　آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گزرا
شوق کا حُسنِ عقیدت دیکھنا اکثر ہوا　　تیری بے پروائیوں پر اشتباہِ التفات
دوستی اُس فتنۂ دوراں کی ہے یا دشمنی　　جان برباد کرم ہے دل تباہ التفات

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ ناشاد کا　　اُن سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا

شوق پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا　　داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا
اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا　　خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا
دل کچھ اس ڈھب سے لئے اس نے کہ بس کوئی　　حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

اُس چشم نے دل بری کے شیوے　　سب سیکھ لئے بغیر اُستاد

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن　　کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

اُس نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہونچے　　سب دل پذیر پہونچے سب دل پسند پہونچے

بعض باتیں شاید اُردو شاعری کے لئے بالکل نئی ہیں اور حسرت کے سوا کسی نے نہیں لکھیں، لیکن وہ حقیقت، اور خلوص سے اس قدر مملو ہیں کہ فوراً دل میں کُھب جاتی ہیں ؎

لوگ سب جان گئے چھپ نہ سکی شوق کی بات
میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا

ہم سے روٹھو بھی تو لازم ہے کہ اک ناز کے ساتھ
قہر بھی ہم پہ کرو تم تو دل آویز کرو!

مجھ پر گدا سمجھ کے بھی کرتا نہیں نظر
دیکھے تو کوئی اُس شہ خوباں کی احتیاط

میں بے خبر غم تھا مگر وہ دم رخصت
دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی

حالانکہ ابتدا بھی نہیں ہے شباب کی
اُن کو کمال حُسن کا دعوےٰ ابھی سے ہے

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات اُن میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز

دیکھ لیتے ہیں اب وہ نامۂ شوق
ہے مگر پھر بھی اختصار کی شرط

تمہیدِ صلح شوق کے سامان ہو گئے
جتنے تھے اُن کے جور سب احسان ہو گئے
حالت قبولِ عذر سے برعکس ہو گئی
میں شوخ ہو گیا وہ پشیمان ہو گئے
تجدیدِ لُطفِ یار کی لذّت میں کیا کہوں
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
اُن کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا
پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے!

یہ آخری چار اشعار ہزاروں نظموں کے ہم پلّہ ہیں۔ صحیح جذبات کی اس قدر پُر سحر مصوّری، پھر تسلسل و روانی، اللہ اللہ!

کُھل کے ہم سے کبھی وہ مل نہ سکے
باوجود کمالِ دل سوزی!

دوسرا مصرعہ ملاحظہ ہو "باوجود کمال دل سوزی" ہر ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ ٹھہر ٹھہر کے پڑھئے "کُھل کے" ملاقات نہ ہو سکی باوجود اس کے کہ محبوب محبت کی آگ سے پھنکا جا رہا ہے۔ ہر حرف نشتر ہے۔ "کمال دل سوزی" کی وسعت پر غور کیجئے۔ پورا شعر ایک مرقع ہے جذبات کا جس قدر غور کیجئے اُسی قدر ایک شریف پردہ نشین محبت کرنے والی کا تخیّلی پیکر نظروں کے سامنے اُبھرتا آئے گا۔

عظمت اللہ خاں مرحوم نے اپنے شاعری والے مضمون میں ایک مشہور انگریز ادیب کی سند پر لکھا تھا "شاعری نام ہے تخیّلی پیکر پیدا کرنے کا" اسی کے ساتھ مثنوی میر حسن سے کچھ اشعار پیش کئے تھے۔ اب غور کیجئے حسرت موہانی نے کیسا پیکر پیش کیا ہے۔ میر حسن کے پیکر کا تصور تو چوٹی، دوپٹہ، اور کمر کے ذکر سے ایک حد تک محدود ہو گیا تھا لیکن حسرت کے شعر میں ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جو اس عالم کی چیز ہوتے

ہوئے بھی مہدی حسن مرحوم کے قول کے مطابق "اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی"۔ حسرتؔ نے محبوب کے خد و خال کو نہیں پیش کیا اُس کے بجائے اس کے اخلاقی اوصاف اس طرح گنائے ہیں کہ شعر ہمارے طائر خیال کو پرواز بخش دیتا ہے اور ہم اپنے مذاق کے مطابق اس سے ایک ایسا خاکہ تیار کرسکتے ہیں جو ہمیں مرغوب ہے۔ دنیا میں معیار حسن مختلف ہیں اور خد و خال کی تشریح سے جو تصویر آنکھوں کے سامنے آئے گی وہ نہیں کہا جا سکتا سب کو یکساں طور پر مرغوب ہو گی۔ حسرتؔ نے ایک زبردست صناع کی حیثیت سے اپنی تصویر کا خاکہ چند نقطوں، چند منحنی اور مدہم خطوط کی مدد سے تیار کیا ہے۔ ان خالی جگہوں کو آپ اپنے خیال سے پُر کیجیے اور دیکھیے تو یہی ایک پاکباز، باحیا، جاں نثار، شریف خاتون کی تصویر اُبھر آتی ہے یا نہیں۔

ایک اور مرقع ؂

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار تیرا حُسنِ شرابی

پیرا ہنِ اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی

وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی

متعلقات حُسن کے انتہائی لطیف جزئیات بلکہ حُسن آفرینی ؂

عجیب اس کی خوشبو ہے کچھ مشک پرور
وہ پرشش جو تھی اس تن نازنیں پر

اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بیقرار کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

اک رنگ التفات بھی اس بیرخی میں تھا اک سادگی بھی اُس نگہِ سحر فن میں تھی

اس روئے جمیل میں ہیں یک جا انوارِ مغارب و مشارق

محبوبی و رنگینی ہیں جزو بدن تیری سرشارِ محبت ہی خوشبوئے دہن تیری

محبوب کے باطنی اوصاف سے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت وہ ستم بھی گر کرے ہی تو بلطف ہوشمندی

تجھ سے ہی حُسنِ جمالِ دوجہاں کی رونق اے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق
ترے حُسنِ نظر افروز کے جلوے اے شوخ ہوگئے ہیں نگہ دیدہ وراں کی رونق

ملٹن شاعری میں تین چیزوں کا طالب ہے "سادگی جوش، اصلیت" حسرت کی غزلوں میں آپ کو یہ تینوں چیزیں ملیں گی، بلکہ یہ وصف آج کل حسرت کے علاوہ آپ کو کہیں اور مشکل سے ملے گا سے

کس قدر دشوار تھی ہم پر جدائی آپکی — بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپکی
بدگماں کا ہے کو ہوتا آپ کا حُسنِ غیور — ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپکی
نے نوازِ عاشقی نے نغمہ ہائے حُسن میں — بارہا آواز کانوں کو سنائی آپکی
رہ گئی اہلِ ہوس میں یادگارِ حُسن و عشق — ناز برداری ہماری دل ربائی آپکی

ذیل کی غزلیں ملاحظہ ہوں، بقول حضرت شاد عظیم آبادی ؎

انھیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانوں میں رندوں کو
انھیں شعروں کو میکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

برکتیں سب ہیں عیاں دولت روحانی کی — واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی
شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے ماہ جمال — کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی
مجھ سے وہ سگ بھی ہے افضل جسے عزت ہو نصیب — آستانِ حرمِ یار پہ دربانی کی
جب سنا یاد کیا کرتے ہو تم بھی تو مجھے — کیا کہوں حد نہ رہی کچھ مری حیرانی کی
سعیِ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال — اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی
وہ تبسم بھی قیامت ہے ترا بعد جفا — تو نے دی ہو جسے خدمت نمک افشانی کی

اللہ اکبر، معلوم ہوتا ہے احساسات کا ایک دریا ہے جو موجزن ہے۔ ہمارا خیال ہے حسرت کے تمام کلام میں اس قدر سادہ پرکار غزل جس کے لفظ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے اعماق دل سے نکلی ہے مشکل سے ملے گی۔

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے — کہ مستغنی ماسوا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم

مٹے عیب سب عشقبازی میں حسرت — نہ بغض و حسد ہے، نہ غصہ نہ کینہ

اب حسرت کے عشق میں روحانیت آچلی، حُسن کے بجائے عشق اور اس کی رنگینیاں ہی غایت زندگی ہو گئیں۔ اُن پر محبت کے حقیقی اسرار روشن ہونے لگے ؎

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے — گدازِ غم اگر چاہے تو مجھکو باخدا کر دے

فکر دنیا سے دل رہا آزاد — اے ترا غم رہے مجھے روزی
مل گیا نور عاشقی سے ہمیں — طرفہ سرمایۂ دل افروزی
محبت نے کی دلپذیر آگ روشن — کہ ہم ہو گئے جسم خاکی ہے نوری

ہو گئے نور عشق سے روشن — دل پہ ارض و سما کے جملہ طبق

وہ مجازی حُسن پرستی کرتے کرتے آخر حُسن مطلق کے پرستار ہو گئے۔ وہ اس مقام پر پہونچ گئے جہاں محبت ذات کی پابند نہیں رہتی، جہاں قیس کو لبنیٰ سے، ہیر کو رانجھا سے، رومیو کو جولیٹ سے محبت نہیں ہوتی بلکہ عشق کو حُسن سے محبت ہوتی ہے، جہاں قیس عامر صحراؤں میں ناقہ سوار لیلیٰ کے لئے دیوانہ وار سرگرداں نہیں پھرتا بلکہ عشق حُسن مطلق کی جستجو میں بھٹکتا پھرتا ہے اور ہر حسین

چیز کو حسنِ مطلق کا جزو سمجھ کر اس پر سر دھنتا ہے اور اس سے اپنی پیاس بجھاتا ہے ؎

عشق تلاشِ حسن میں خاک بسر ہے در بدر
ہر طرف ہیں عیاں نقوشِ جمال دیدنی ہے نگار خانۂ روح

ہر صبح جہاں وہ جلوہ گر ہوں جاتے ہیں وہیں لے واں واں ہم

ضیائے مہر ہے نورِ قمر ہے جمالِ یار ہر سو جلوہ گر ہے

اس راہ میں دل سبک اور نحیف ہو جاتا ہے، نظر بلند ہو جاتی ہے اور مسرت و غم میں کوئی امتیاز نہیں رہتا ؎

جنوں نے دل سے وہ حس بھی مٹا دی کرے جو امتیازِ رنج و شادی

خدمتِ خلق اور رضا جوئی حق ایمان رہ جاتا ہے ؎

پڑھئے اس کے سوا نہ کوئی سبق خدمتِ خلق و عشقِ حضرت حق

امیری میں ہو یا فقیری میں حسرتؔ بہرحال ڈھونڈیں گے ان کی رضا ہم

یہاں تک کہ خود قوتِ احساس اس ایک ذاتِ حق میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے ؎

رہ گئے ذاتِ حق میں ہو کے فنا اب نہ ہم ہیں نہ دل نہ سوز نہ ساز

حسرتؔ نے عشقیہ شاعری کے علاوہ ملک و ملت کی خدمت بھی کی

اور ایک عمر جیل خانہ میں گزاری اُن کا زیادہ تر کلام زمانۂ نظر بندی میں لکھا گیا ہے۔ اُن کے پولٹیکل خیالات کے متعلق مختلف رائیں ہیں لیکن اُن کے خلوص اور ایثار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے اپنی عمر، دولت اپنا کاروبار، اپنی زندگی ملک وملت کے لئے وقف کر دی۔ جس ایثار سے، جس خاموشی اور سکون کے ساتھ حسرت نے مظالم اور مخالفتیں برداشت کیں ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔

حسرت کے سیاسی مسلک سے علیحدہ یہاں اُن کے عمومی خیالات پیش کئے جاتے ہیں جو اُن کے خیال میں ہماری بیداری اور فتح کے لئے ازبس ضروری ہیں ؎

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمّتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اُس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر

خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں اُن سے بیزار ہو کر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

غرضکہ حسرت کی شخصیت عجیب و غریب ہے اُن کی شاعری کے اوصاف آپ نے دیکھ لئے۔ اُن کا پیغام بھی آپ کے سامنے آگیا۔ اس قدر بڑے شاعر اور زبردست مصلح ہونے کے باوجود وہ اپنی تعریف و توصیف سے ہی نہیں دُنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہیں۔

حسرت کا اپنی نسبت فیصلہ خود حسرت کی زبان سے سنئے ؎

گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں — میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں
عجب انداز ہے میرے مزاجِ لااُبالی کا — نہ ممنونِ تمنا ہوں نہ مشتاقِ مسرت ہوں
مری بے تابیوں کا قول ہے ہم جانِ تمکیں ہیں — مری اُفتادگی کہتی ہے تاجِ فرقِ عزت ہوں
مرا شوقِ سخن پروردۂ آغوشِ حرماں ہے — میں خود شیدائے غم ہوں کشتۂ دردِ محبت ہوں
نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا — تکلف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں

کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

نہیں حسرت تو "بیگانۂ رسمِ شکایت" ہے یہ تیری عالی ظرفی ہے تو نے "اپنی داد خود" بہت دے لی لیکن اُردو کو اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں!

(جامعہ، دہلی - مارچ ۱۹۲۸ء)

طنزیاتِ مومنؔ

عام طور پر "طنزیات" کے ذیل میں تمام ظریفانہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں اور کُل ظریف انشا پردازوں کا شمار "طنز یین" کی صف میں کیا جاتا ہے۔ خود تھیکرے ظرافت اور طنز میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا۔ مگر میری ناقص رائے میں ان دونوں میں نہایت نازک فرق ہے۔ طنز زیادہ سے زیادہ ظرافت کی ایک شاخ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کا مقصد کبھی محض تفریح و انبساط ہوتا ہے اور کبھی اس کا مقصد اس سے بلند تر یعنی ظرافت کے پردے میں اصلاح و تربیت۔ عام ہنسنے ہنسانے والی تحریروں میں جس مقام سے کسی پر چوٹ شروع ہو، کوئی چبھتا ہوا، مزیدار یا اچھوتا فقرہ کسا جائے، خواہ پھولوں کی چھڑی سے "خبر" لی جائے یا دل کھول کر مرمت ہو وہیں سے طنز کا آغاز ہوتا ہے۔

بعض لوگ اس کی ایک اور تعریف کرتے ہیں یعنی طنز ایک طرز انشا، ایک خاص انداز بیان کا نام ہے جس میں "دور کی کوڑی" لائی جائے۔ لکھنے والے کو جو کہنا ہے اسے اس طرح کہے گویا مقصود اس کا بالعکس

ہے لیکن طنز کو صرف ان معنوں میں دیکھنا اس کی وسعت کو محدود کرنا ہے۔ طنز کے لئے ندرت کا ہونا بھی لازمی ہے ندرتِ بیان اور ندرتِ معنی دونوں ورنہ بہ صورت دیگر وہ ایک سطحی، پست، اور رکیک چیز ہو کر رہ جائے گی اور اعلیٰ درجہ کے لٹریچر میں جگہ پانے کی مستحق نہ رہے گی۔

یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی زبان میں طنز ایک نہایت وسیع اور مخصوص صنف ادب شمار کی جاتی ہے جس کی خود اپنی علیحدہ صنفیں ہیں۔ وہاں طنزیہ لٹریچر بہ افراط موجود ہی۔ انگریزی کے سب سے پہلے شاعر چاسر سے لیکر بائرن، برنارڈ شا اور چسٹرٹن تک کم و بیش ہر زمانے میں چوٹی کے طنز گو شعرا و نثر نگار، موجود رہے ہیں۔ ان کے ہاں طنز سے بڑے بڑے اصلاحی کام لئے گئے ہیں۔ یہ موضوع ایک دوسرے مضمون کا محتاج ہے جس کی یہاں گنجایش نہیں۔ اُردو زبان میں بھی طنز موجود ہے لیکن وہ صرف چند خاص اُمور تک محدود ہے اور اس سے بہت ہی شاذ اصلاح و ہدایت کا کام لیا گیا ہے۔ اور ایسے شعرا یا انشا پرداز تو بہت کم ہیں جنھوں نے اس صنعت تحریر کی ترقی و تہذیب ہی کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہو۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں ظریف انشا پردازوں یا شاعروں کی کمی ہے۔ نہیں ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ہجو گو شعرا اور مزاح نگاروں سے سابقہ رہا ہے لیکن سچی اور پاکیزہ طنز ان کے ہاں برائے نام ہے یہ مضمون ایک شاعر کی نسبت ہے اس لئے بالفعل

صرف شاعری ہی میں طنز کو تلاش کرنا ہے۔ اُردو شاعری میں ہمیں کافی ظریف شاعروں کے نام ملتے ہیں جعفر کی "زٹلیات" سے قطع نظر کی جائے تو میر ضاحک، بقا، فدوی، مکین کے ناموں کے علاوہ سودا، انشا، مصحفی، غالب، مومن اور آخر آخر میں حضرت داغ (جن کا بے مثل شعر ؎

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو!

ہر خوش مذاق اور زندہ دل سخن سنج کے زبان پر ہے اور ان کی چلبلی، شوخ اور چٹ پٹی طنز کی دل کش مثال ہے) ریاض خیر آبادی اور اکبر الہ آبادی کے اسماء گرامی پیش پیش ہیں۔ موخر الذکر بزرگ اس فہرست میں سب سے آخر لیکن خالص ظریفانہ حیثیت سے سب پر فائق ہیں۔

ایک اور ظریف شاعر ظریف لکھنوی کا نام بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان سب شعرا میں سے حضرت اکبر کو چھوڑ کر جنھوں نے طنزیات کا وہ وسیع مفہوم سمجھا جو سمجھنا چاہیئے اور جو اسے دوسری زبانوں میں حاصل ہے اور طنز کو زندگی، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب، تمدن، غرض اپنے زمانہ کی زندگی بلکہ حیات و ممات کے مختلف اور لاتعداد پہلوؤں پر ناقابل تقلید اور قابل رشک طریقہ سے حاوی کر دیا اور حضرت ظریف سے بھی قطع نظر جن کی شاعری کی خصوصیات جُدا ہیں دیگر شعرا نے صرف کبھی کبھی ہنستے ہنسانے کے لئے اور محض ایک مخصوص حد تک طنز سے کام لیا۔ ان سب شعرا کا میدان کارزار کم و بیش غزل ہے جس میں تلاش سے طنزیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ زیادہ

کیا تمام تر شیخِ عصر، واعظ، محتسب، یا ناصح پر چوٹیں ہوتی ہیں، مزے میں آکر یہ حضرات ان بیچارے غریبوں کو رسوا اور ذلیل کرنے کے ساتھ خود بھی تہذیب اور حُسنِ ذوق کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ناک پر انگلی رکھ کر مٹکنے لگتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس طرف سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے اور انھیں کے زمانے کے مذاق سے انہیں جانچنا چاہیئے۔ یہ ابتدائی اور غیر تربیت یافتہ دور قوموں کی تاریخ کی طرح ادب اور شاعری کی تاریخ میں پایا جانا بھی بالکل مطابق فطرت ہے۔

ان مختصر حدود کے اندر بھی سودا سے قطع نظر جنھوں نے اس چیز کو امتیاز بخشا اور جن کی طنز میں زہر ہلاہل بھرا ہے مومن کو ہمارے نزدیک "طنزیات" میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے[1]۔ سودا کو بعض اور وجوہ سے بھی علیحدہ کرنا پڑتا ہے اوّل تو وہ طنز کو غزل میں بہت کم جگہ دیتے ہیں، وہ اسے ایک مستقل حیثیت دے کر نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ دوسرے ان کے موضوعات کا دائرہ اس محدود دائرہ سے زیادہ وسیع ہے اور وہ اس فرض کو محض رسماً اور تبرکاً جیسا کہ اور شعرا کا دستور ہے نہیں ادا کرتے بلکہ یہ چیز ان کا حصہ ہو گئی ہے۔ اس حیثیت سے وہ بہت بلند درجہ پر ہیں اور مومن ان کی گرد کو نہیں پہونچتے، ساتھ ہی سودا اعتدال

---

[1] تعجب ہے کہ شیخ محمد اکرام نے اپنی قابل قدر کتاب "آثارِ غالب" میں یہ کیسے لکھ دیا:-
"ایک قابلِ ذکر چیز ظرافت ہے جو دیوانِ مومن میں قطعاً نہیں"!

سے گزر جاتے ہیں اور ایسے پنجے جھاڑ کر لوگوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ان سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی طنز کی مار شاہی شیر بچے کی مار سے کم نہیں۔ ان کی طنز کی زد سے لوگ اس طرح خائف رہتے ہیں جیسے شہ باز کے پنجے سے کمزور پرند، برخلاف مومن کے کہ طنز ان کا پیشہ نہیں ہے اور ان کے ہاں ایسی بے اعتدالی نہیں پائی جاتی۔ وہ بہت احتیاط سے اور بچ بچ کر اپنے حریفوں پر وار کرتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر سودا اور مومن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ریاض خیرآبادی کی "طنزیات" بھی خاص لطف رکھتی ہیں اور حقیقت میں موجودہ شعرا کیا شعرائے سابق میں بھی ان کے مخصوص اوصاف و انداز میں ان کا کوئی مقابل نہیں لیکن ان کے ہاں بھی شوخی بے باکی اور ہوس ناکی کبھی کبھی ہمیں آنکھ اور کان بند کر لینے پر مجبور کرتی ہیں

حسب معمول مومن کی طنزیات بھی غزل میں ملتی ہیں اور ان کے بھی وہی محدود موضوع ہیں جن پر اور شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً ناصح پر چوٹ، واعظ پر بوچھار، رقیب کی ملامت و بدخواہی، محتسب سے چھیڑ چھاڑ۔ لیکن انھوں نے یہ کام ایسے اہتمام سے کیا ہے اور ان کی طنز میں ایسا مزہ ہے اور ایسے ایسے نادر طریقوں اور امتیازی انداز بیان سے انھوں نے ان سب حضرات کی خبر لی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھیں اس کا خاص شوق تھا اور اس میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا بالخصوص ناصح اور واعظ سے تو ان سے ایک منٹ کو نہیں بنتی۔ وہ ان کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی بھی کیا بدظنی! وہ بیچارے تو ان کی ہمدردی اور دل سوزی

میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور یہ اس کے برعکس ان کے نام سے بیزار ہو جائیں۔ مگر ہمیں اس سے کیا، مومن کے خیر خواہوں یا بد خواہوں کو مومن سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ مانا کہ ان کی رفاقت بے لوث ہے مگر یہ عشق وہ بُری بلا ہے کہ عاشق کو خود معشوق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو تسکین دوا سے ہو نہ تخفیف دوا سے!

ہمیں تو ان کے ناصح مشفق ہمیشہ منھ کی کھاتے نظر آئے۔ مومن کے مزاج میں بڑی مستقل مزاجی ہے۔ وہ اُن کو منھ نہ لگانے کے بجائے ان کی معصومیت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ گھوم گھام کر وہ حضرت ناصح یا واعظ کی خدمت میں پہونچ جاتے ہیں۔ انھیں ایک طنزیہ تمسخر آمیز سلام کرتے ہیں اور ان کی صحبت سے لطف اندوز اور تازہ دم ہو کے آگے بڑھتے ہیں۔ دس پانچ منٹ حُسن و عشق یا اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور حضرت ناصح سے ایک خاص پُر لطف طرز سے مُصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حُسن و عشق کا ذکر بھی خیر سے انھیں حضرات کو جلانے اور تڑپانے کے لئے کرتے ہیں۔ ناصح کا نام آیا اور ان کے چہرے پر شگفتگی دوڑ گئی ۔۔۔ ثبوت لیجئے۔ کم و بیش ہر غزل میں دو چار چھ عشقیہ اشعار کے بعد وہ ان حریفوں پر وار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی عام خصوصیت یعنی انداز بیان کا انوکھا پن، جو اُن کی شاعری کی جان ہے، یہاں بھی ہر قدم پر موجود ہے اور اس وصف نے ان کی طنزیات کو اور زیادہ دل کش، با معنی اور پُر لطف بنا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ مومن کے کلام کی اس خصوصیت پر اب تک کسی کی نظر نہ پہونچی۔ حالانکہ اُن کے ہاں

یہ طنزیات دبی ہوئی، چھپی ہوئی ہونے کے بجائے واضح اور نمایاں معلوم ہوتی ہیں اپنے بیان اور معنی دونوں کی ندرت کی وجہ سے وہ پہلی نگاہ میں نظر آجاتی ہیں۔

میں ان طنزیہ اشعار کا ایک مختصر انتخاب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت پیش کرتا ہوں۔ مومن کے کلام میں بالعموم حسب ذیل موضوعات پر طنزیات ملتی ہیں :-

۱۔ مذہب و تقدس۔ اس موضوع پر ان کی طنزیات زیادہ تر مقطعوں میں ملتی ہیں جہاں وہ اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بات ضرور پیدا کرتے ہیں۔ اس کے پردے میں کہیں واعظوں سے نوک جھوک اور کہیں بتوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے ؎

دشمن مومن ہی رہے بُت سدا   مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مومن کا مقطع ان کی غزل کی جان ہوتا ہے یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت سے شعرا تو محض غزل مکمل کرنے کے لئے مقطع کہتے ہیں۔ مومن کا مقطع اس قدر مشہور ہے کہ یہاں اس کی مثال پیش کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے تاہم یہ چند مقطعے ملاحظہ ہوں ؎

ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ   مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن   کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

بُت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے   مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ
اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر

ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں
ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار

یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو
مومن تم اور ذکر بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن

ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے
خدا کی بے نیازی ہائے مومن

۲- مومن کی طنزیات کا خاص میدان واعظ اور ناصح مشفق پر چوٹ کرنا اور ان کی فضیحت کرنا ہے۔ اسی میدان میں ان کی ظرافت اور زندہ دلی کے جوہر کھلتے ہیں۔ دیکھئے کس کس رنگ میں اور کن کن پہلوؤں سے ان حضرات کی خبر لی گئی ہے۔ اگر اس کے عنوانات قایم کئے جائیں تو تفصیل و تشریح نہ صرف طوالت بلکہ لطف کی کمی کا باعث بھی ہو جائے گی۔ قابل غور بات انداز بیان اور مضمون دونوں کا انوکھا پن ہے جس خصوصیت کی طرف مضمون کی ابتدائی سطور میں توجہ دلائی جا چکی ہے ؎

ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ
ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترک بتاں اے واعظ

مجلس وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ
منتظر ہے کسی بت کا جو نہیں، تو کیوں ہے!

شعلۂ آتش دوزخ ہے زباں اے واعظ
سچ ہے کافر تری تقریر سے کیوں کر نہ جلیں

ڈر مری آہ سے ظالم، نہ جلا جی، کہ نہیں
یہ جہنم سے تو کم شعلہ نشاں اے واعظ

اہلِ جنت سے کرو دل بری حور کا ذکر
ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ

کیسی آرام پس مرگ، نگر کافر تو
اہلِ اسلام کا ہے دشمنِ جاں اے واعظ

شرم کی بات نہیں ہے یہ، اثر ہو کیوں کر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیر مغاں اے واعظ

نچوڑیں گے ہم اپنا دامن تر
جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

تو یہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

" فرمائے ہے " کے ٹکڑے نے کیسا مزہ دیا۔ ایک تو شعر کے یوں ہی کیا کم لطیف معنی تھے اس پر یہ طرزِ بیان! اسی طرح کا ایک اور شعر ہے ؎

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آ گیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

" وسعت کلام " کی وسعت ملاحظہ ہو اور پھر اس کی نشتر زنی۔ ممکن نہیں کہ وار خالی جائے اور ایسی چوٹ کھا کر ناصح جاں بر ہو سکے۔ رعایت کے متلاشی " وسعت " کے ساتھ " جی تنگ آ گیا " میں خوبی کا ایک اور پہلو نکال سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں " جان نہ لے " کا ٹکڑا کس قدر بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ تو مجھے پریشان نہ کر، میرا سر نہ کھا۔ دوسرا اور لطیف تر پہلو یہ نکلا کہ دل تو محبوب کی نذر ہو ا اب جان تو لیتا نظر آتا ہے۔ پورا شعر کس قدر دل کش بلیغ اور پر لطف ہے۔

میں تو دیوانہ تھا اس کی عقل کو کیا ہو گیا
قیس کہتا ہے مجھے، ناصح کو سودا ہو گیا

ناصح کی دیوانگی کس طرح ثابت کی ہے۔ کیا خوب!

پوچھنا حالِ یار ہے منظور
میں نے ناصح کا مدعا جانا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں
پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

اس میں بھی خاص بات ہے۔ مومن کو چاک کے ٹانکنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ ناصح کی اس سینہ زوری پر کہ وہ ہر بار، ٹانکتا ہے برہم ہیں اب تو محض ضد کی وجہ سے وہ ایک تار بھی ثابت نہ چھوڑیں گے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہے کیوں دیوانہ وار
میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جاتا ہے دل

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح
گر نہیں یقین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو رے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اثر ہوتا ہے کب ہم سے وفاداروں کو اے ناصح
فغاں سے پیشتر تم خجلتِ تقریر تو کھینچو

اے ناصحو، آہی گیا وہ فتنۂ ایام، لو　　ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی　　جرم ثابت ہو گیا انکار سے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون　　اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں　　کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے　　اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

منھ کو نہ سیا ناصح، کی بخیہ گری اتنی　　لوں میں بھی ابھی لتے ہے پردہ دری اتنی

یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے　　کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

اچھے موقع پر ناصح کی یاد آئی۔ اسی کو پیغامبر بنا کر بھیج رہے ہیں۔

نہ کرنی تھی نصیحت اُس کے بیٹھے پر قیامت کی　　عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنے اٹھاتا ہے

ناصح "فتنہ" ہو یا نہ ہو شاعر کے فتین ہونے میں کوئی کلام نہیں جس نے ایسا موقع پیش کیا۔ اور لیجئے، اب کے تو ناصح صاحب بری طرح پھنسے سے

کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا　　اب تو باندھوں گا میں ناصح اس کو بھی زنجیر سے

۳۔ تیسرے درجہ پر ان کی وہ طنزیات ہیں جو انھوں نے محتسب یا رقیبوں پر کہی ہیں اور جو تعداد میں نسبتاً بہت کم ہیں۔ بایں ہمہ لطف سے

خالی نہیں۔ مثلاً ؎

خاک میں حیف یہ شراب ملے　　محتسب بادہ خوار ہونا تھا

محتسب ہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے　　نہ لنڈھا، پی لے، مے ناب ہے، زہر آب نہیں

رندوں پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا　　اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

پسِ شکستنِ خم زجر محتسب معقول　　گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

غیر نکلا ترے گھر سے، گئی اس وہم میں جاں　　غل ہوا چور کا اس کوچہ میں گر آخر شب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب!　　غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب!

"بھلا صاحب" نے کیا بات پیدا کی۔ شعر کو سچی طنز کا ایک تیز نیچہ بنا دیا۔

۴۔ شاذ و نادر شعرائے ہم عصر پر بھی طعن و تشنیع ملتی ہیں لیکن وہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔

(جامعہ دہلی اپریل ۱۹۲۳ء)

انتخاب غزلیات حالؔی

حالؔی کی شخصیت ایک جامع کمالات شخصیت تھی سرسیّد کے ادبی رفقا میں اُن کی حیثیت خاص تھی۔ پہلے تو انہیں اُردو زبان کا ایک زبردست نیچرل اور قومی شاعر نہیں بلکہ قومی شاعری کا بابا آدم کہئے۔ کیونکہ مولانا آزادؔ کی ابتدائی کوششوں کو چھوڑ کر دراصل جس شاعر نے جدید رنگ کی نظموں کو ایک ترقی یافتہ شاعری کی صورت میں پیش کیا اور جس کا اثر بعد کے شعرا پر پڑا اور جس کے متبعین پیدا ہوئے وہ حالؔی ہیں۔ اُن کی دوسری ادبی حیثیت نثر کے میدان میں ایک سوانح نگار کی ہے۔ یہ ایسی حیثیت ہے جس کا آغاز اور انجام غالباً اُنہیں کے نام سے وابستہ ہے۔ مشکل سے کوئی شخص ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جو اپنی خصوصیاتِ فن کے لحاظ سے اُن کا ہم پلّہ ہو۔ اُن کی تیسری حیثیت ایک ماہر تنقید کی ہے۔ جب تک اُن کا غیر فانی مسدّس اور اُن کی نیچرل نظمیں۔ جب تک اُن کی حیاتِ جاوید اور حیاتِ سعدی، جب تک اُن کی یادگارِ غالب اور اُن کا مشہور مقدمہ

زندہ ہیں اُن کی یہ تینوں حیثیتیں مسلّم اور باقی رہیں گی۔

میں حالی کی ایک اور حیثیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یعنی ان کی غزل گوئی کا۔ میں جانتا ہوں کہ حالی کے لئے یہ فخر کی بات نہ تھی کہ وہ غزل بھی کہتے تھے، نہ زمانہ اس حیثیت سے اُنہیں زندہ رکھے گا کہ وہ ایک بہترین غزل گو تھے۔ تاہم غزل کے لئے یہ امر ضرور قابلِ افتخار رہے گا کہ حالی جیسی شخصیت نے بھی اس صنفِ سخن کو ناگزیر سمجھا۔ اس آخری حیثیت میں اُن کا کلام زیادہ توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا گیا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ جب لوگ اُن کی غزلیں زیادہ غور سے پڑھیں گے تو اُنہیں اُن کی یہ چوتھی حیثیت بھی ویسی ہی کامیاب، ویسی ہی درخشاں نظر آئے گی جیسی اُن کی دوسری حیثیتیں۔ کم از کم انکی غزل قابلِ اعتراض نہیں سمجھی جائے گی۔

عرصہ ہوا رسالہ جامعہ دہلی میں کوشش کی گئی تھی کہ حالی کو غزل گو کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ زیادہ بارآور نہیں ثابت ہوئی۔ یہ غالباً پہلی کوشش تھی۔ اس لئے لائق قدر۔ میں نے بھی حالی کی غزلوں کا انتخاب ۱۹۲۵ء میں کیا تھا جو اُسی سال کے دسمبر کے مہینہ میں میری بیاض میں نقل کیا گیا تھا۔ آج اس انتخاب کا کچھ حصہ اسی بیاض سے نقل کرکے ناظرین نیرنگِ خیال کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اشعار کے ساتھ اپنی کوئی رائے نہیں پیش کروں گا۔ بعض بعض جگہ صرف اشاروں اور کنایوں سے کام لوں گا۔ کلام کی خوبی خود لوگوں کو متوجہ کرے گی، عمومی طور پر اتنا ضرور کہوں گا کہ حالی نے کئی لحاظ سے اپنی

دُنیا الگ آباد کی ہے مگر اُن کی غزل کے خاص اوصاف اصلیت اور سادگی، بعض وقت قدما کے ایک وصف معصومیت کے ساتھ مل کر بڑا لطف دے جاتے ہیں سے

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا
میخانہ کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا!

رونا نہ ہوگا حالیؔ شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا
الفت میں دمبدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر[1]
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا!
یا رب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں ہوں وہ دن نہ دکھانا
لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا "خبردار! کہ نازک ہے زمانہ"

---

[1] قیام پاکستان کی تقریب اور مسلمانان ہند کی بے پناہ ہجرت کے پس منظر کے ساتھ یہ شعر پڑھیں تو دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا
آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالیؔ
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا!

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا
چُپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چُکایا جاتا
نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا
عشق[1] اُس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بہت بعد میں اس کی تصدیق یوں کی: "جس طرح نبوّت بطنِ مادر سے شروع ہوتی ہے عشق بھی عہدِ طفلی سے آغاز ہوتا ہے" (محاسن کلام غالب)

عشق سُنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

آخری شعر عشق کی کس قدر مختصر مگر جامع تعریف ہے۔ اس شعر کی سادگی، بانکپن اور اصلیت نے خاص شہرت حاصل کرلی ہے اور اُردو کے بہترین اشعار کا انتخاب کرتے وقت اسے ہرگز ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

جو جان سے درگزرے، وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا
کل حالیؔ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا، تم نے بھی سُنا ہوتا

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا
ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے، ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

اگرچہ غالبؔ نے بھی کچھ اسی قسم کے جذبہ سے متاثر ہو کر کہا ہوگا ؎
وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں
مگر ذاتی طور پر مجھے شاگرد کے شعر میں براہ راست تخاطب اور چھیڑ کے پہلو کی وجہ سے زیادہ لطف ملتا ہے۔

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا
بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہا ہی کا وقت پہونچا مری رُسوائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا[1]!

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا سینہ میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اور یہ اشعار تو واقعی "ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال" کے مصداق ہیں، کون کہتا ہے کہ حالی کا انداز شعر گوئی روکھا پھیکا اور خشک ہے ؎

قلق اور دل کا سوا ہو گیا دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا!

آنے لگا جب اس کے تمنا میں کچھ مزا کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

---

[1] جرأت بلند مرتبۂ عشق ہے بہت ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں ورے ورے!

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت!

گو زمانہ نے بھلادی دل سے اپنے فصلِ گل — یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

"صدائیں خاص خاص" نے شعر کو اصلیت سے قریب ترین کر دیا۔
بہترین موسیقی میں بھی ہر مقام وجد کرنے اور یاد رہ جانے کے قابل نہیں ہوتا۔ چند خاص تانیں اور کھٹکے ہی دل کو برماتے اور "آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد[1]" آتے رہتے ہیں!

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے زمانہ کا سدا ایک ہی شخص

چھپا کے اس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے — جب آپ منہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک
وہ عشق ہے نہ جوانی، وہ تو ہے اب نہ وہ ہم — پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری صدا ایک ایک

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے — دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق — بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

---

[1] جوش:
گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے — آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

اک یہاں جینے سے بیزار نہیں ہیں یارب — یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

تول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار — ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا — لے جائے ہم کو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر — وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں [۱]

روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

---

[۱] جلیل قدوائی: کل یک بہ یک کہیں سے مری محفل آگئے — سب رند رہ گئے مئے و ساغر لیے ہوئے!

ذرا اس غزل کے مطلع کو دیکھئے گا۔ انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس بھری دنیا میں اسے ایک محرم بھی نہیں ملتا اور اس کی زبان ادائے مطلب سے قاصر نظر آتی ہے ؎

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں | مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح | لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا | بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا | اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں[1] میں

بہت خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

وفا اغیار کی اغیار سے سُن | مری الفت در و دیوار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق | ہماری چشم دریا بار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست | کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالؔی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ہے اُن کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی | وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ اُن کی مہربانی
عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہو | دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی
دیکھا جمال جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے | کیا جانے کس ادا سے کی اس نے دل ستانی

---

[1] غالب :-

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا | فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو　　تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

اور ان اشعار میں تو حالی کی زبردست سادگی اور واقعیت کے ڈانڈے عالم گیر حقیقت سے مل گئے ہیں ؎

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی　　یہ کشتی یوں ہی پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا　　ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا　　کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
سُنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار　　اس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجئے

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے　　آپ کُچھ سُن کے مسکرانے لگے
ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں　　وہ اگر ہمت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے　　اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
وقت رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے　　ملاپ اُن سے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی　　کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

حالی کے معترض مجھے خدا را یہ بتائیں کہ اگر وہ سچے شاعر نہیں تھے تو اُن کی اب جو غزل پیش کرتا ہوں اس میں " لگاوٹ " کہاں سے آئی ؎

آج دل لے گا اگر کل نہ لیا، یاد رہے
جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے

یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
شوق بڑھتا گیا جوں جوں کہ کے اس شوخ نہ ہم

اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہے وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا یاد رہے

محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے
نہ واں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی

مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات

بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے

ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت

صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں

اور خاتمہ پر یہ شعر سنئے جس سے سجاد حیدر مرحوم میرا دل بڑھایا کرتے تھے۔

اب لیا چشمۂ بقا تو نے!
رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا

حالی کی غزل میں سادگی اور اصلیت کا یہی عنصر تھا جس نے غزل کے خلاف اُن کی تنقید کے باوجود مصلحین غزل صفی، حسرت، عزیز وغیرہ پر غزل میں جدت کے امکانات روشن کر دیئے جدید غزل کی روایت کا یقین دلا دیا۔ چنانچہ وہ اپنے اصلاحی کام میں مشغول ہو گئے اور اُن

کی کوششوں سے غزل کو دوبارہ زندگی بلکہ "زندگی جاوداں" حاصل ہوگئی۔

(نیرنگ خیال لاہور، سالنامہ بابتہ سنہ ۱۹۲۹ء)

جگت موہن لال رواںؔ

گُلِ ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھ اے مرے خلاق حُسنِ رائیگاں میرا

زمیں پر بار ہوں اور آسماں سے دور اے مالک
نہیں معلوم کچھ آخر ٹھکانا ہے کہاں میرا

ہوئی جاتی ہے تنہائی میں لذت روح کی ضائع
لٹا جاتا ہے ویرانہ میں گنجِ شائگاں میرا

ہوا اُس کو اُڑا لے جائے یا اب پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا مری جب آشیاں میرا

یہ کہہ کر روح نکلی ہے تنِ عاشق سے فرقت میں
مجھے عجلت ہے، بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

عناصر ہنستے ہیں دُنیا کی وسعت مسکراتی ہے
کسی سے پوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

ابھی تک فصلِ گل میں اک صدائے درد آتی ہے
وہاں کی خاک سے پہلے جہاں تھا آشیاں میرا

رواںؔ سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا!

دنیا کی شاعری میں کم شاعروں نے ایسے سچے، پُردرد اور حسبِ حال اشعار کہے ہوں گے۔ وہ بے چین ہستی جس نے مدّت ہوئی اپنی روح کی کشاکش کو اس طرح بے نقاب کیا تھا اور ۴۵[۱] برس تک اس عذاب

۱؎ تاریخ پیدائش ۱۴ر جنوری ۱۸۸۹ء

میں مبتلا رہی، آخر ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء کو دن کے ۱۱ بجے اس ناپائدار دنیا سے چل بسی۔ اُس کی ازلی مضطرب و متجلّی روح کو قفسِ تن کی فضا تنگ و تار نظر آئی اور اُس نے دوسرا آشیانہ تلاش کیا۔ معلوم نہیں وہاں بھی اُسے آسودگی نصیب ہوئی یا نہیں!

۲۲ ستمبر ۱۹۳۴ء کی شب کو دس بجے، یعنی مرنے سے چار دن پہلے، میں اور رواںؔ اس مسئلہ پر جھگڑ رہے تھے، کہ دوسرے دن علی الصباح شکار پر چلا جائے۔ چونکہ میں دوسرے دن لکھنؤ پہونچنے کے لئے اپنے ایک عزیز کو لکھ چکا تھا اور اُن سے جھوٹا نہ ہونا چاہتا تھا اس لیے شکار کا پروگرام ملتوی کرنا چاہتا تھا۔ مگر رواںؔ دوسروں کو بھی دعوت دے چکے تھے اور مُصر تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ شکار پر جاؤں۔ بہر حال مسئلہ یوں طے ہوا کہ رواںؔ شکار پر جائیں میں لکھنؤ جاؤں مگر شام کو ہم دونوں اُناؤ واپس آجائیں اور شکار ساتھ کھائیں۔ افسوس میں اس وعدہ پر قائم نہ رہ سکا۔ لکھنؤ میں میرے عزیز نے نہ صرف مجھے انتہائی اصرار کے ساتھ روک لیا بلکہ میرے بیوی بچوں کو بھی اُناؤ سے بلوالیا اس لئے اور بھی کہ میں "تعطیلاتِ خزاں" میں صرف چند دن کے لئے علی گڑھ سے وطن گیا تھا اور کچھ نہیں معلوم تھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ بڑی مشکل سے ۲۶ ستمبر کو بعد دوپہر مجھے واپسی کی اجازت ملی۔ اُناؤ واپس پہونچکر موٹر سے اُترتے ہی پہلی خبر جو کانوں نے سُنی یہ تھی کہ رواںؔ اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ . . .

آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے، مجھے سکتہ ہوگیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کان کسی طرح یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ دل اس غم کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھا۔ مجھے تو اُن سے اپنی وعدہ خلافی کی معذرت کرنا تھی، اور نہ معلوم کتنے کام اُن سے لینے باقی تھے۔ نتیجہ یہ کہ طبیعت بے قرار ہوگئی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

اُن کی موت کا واقعہ مختصراً یہ ہے۔ ۲۳ر ستمبر کی شام کو وہ شکار سے واپس آئے۔ چند جنگلی کبوتروں کے سوا اُنھیں کچھ نہ ملا جنھیں اُنھوں نے گھر واپس آکر پکوا کے کھایا ع

شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے!

اکثر اُن کی زبان پر رہتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ یہ مصرعہ اُنہیں پر صادق آئے گا۔ رات کو نکھری ہوئی چاندنی میں اپنے عالی شان مکان کی اوپری منزل کی چھت پر صبح کے دو بجے تک اپنی زیر تالیف مثنوی "گوتم بدھ" کے اشعار کہتے رہے، پھر وہیں شبنم میں سو گئے۔ صبح اُٹھے تو کسل تھا اور حرارت بھی تھی۔ اسی حالت میں نہائے۔ اتوار کا دن تھا اس لئے آرام کیا مگر بخار چڑھ آیا جس کا معمولی علاج ہوا۔ دوسرے دن بخار ہی کی حالت میں اپنے مقدمات کی پیروی کی۔ تین بجے عدالت سے واپس ہوئے تو حالت بہت خراب ہوگئی۔ اسی رات سرسام ہوگیا۔ کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ تیسرے دن صبح آٹھ بجے زبان بند ہوگئی۔ گیارہ بجے دن کو سخت اضطراب کی حالت میں دم توڑا.......

ہوش کی حالت میں دل پر بار بار ہاتھ رکھتے تھے اور شدید درد بتاتے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ حرکتِ قلب رُک گئی۔ حکیم کہتے ہیں کہ خون میں زہر چھٹک گیا۔ اس لئے اور بھی کہ مرنے کے بعد ناخن اور باہیں اور گلے کے نیچے تک جسم سیاہ پڑ گیا تھا، غرضکہ مرض الموت سے مفر نہیں۔۔۔ چھوٹے بچے کو بار بار گود میں لیتے تھے، مرنے سے پہلے بسترِ مرگ کے چاروں طرف اپنے اعزا کو حسرت دیاس سے دیکھتے تھے، خصوصاً بیوی بچوں اور بھائیوں کو اور اپنے مکان اور سارے سامان کو دیکھتے تھے۔ معلوم نہیں اس آخری ساعت میں دل پر رنج و غم کا کیسا غلبہ ہوگا مگر زبان سے اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے "اب ہم جاتے ہیں!" وہ بھی کس تکلیف سے کہ سُننے والوں کے جگر شق ہوگئے ؎

ایسے اے دوست تم ہوئے ہم سے جُدا ۔ باقی نہیں کچھ بھی زندہ رہنے کا مزا
تم کہہ سکے ہم سے کچھ نہ ہم کچھ تم سے ۔ معلوم نہیں دلوں پہ گزری کیا کیا

اُن کے گھر والوں، خصوصاً بیوی بچوں کی حالتِ زار کیا بیان کی جائے۔ لکھتے ہوئے قلم کا کلیجہ پھٹتا ہے۔۔۔۔۔

اُسی وقت اُنھیں گنگا گھاٹ لے جانے کا انتظام کیا گیا۔ چار بجے سے گئی اور اُن کے اعزا و اقربا کے علاوہ کیا ہندو کیا مسلمان سیکڑوں آدمی موٹروں، تانگوں اور یکوں سے گنگا گھاٹ گئے۔ بہتیرے ریل سے گئے اور جس وقت لاش اُٹھی ہے اُس وقت بلا مبالغہ آدمیوں کا ایک سیلاب تھا کہ اُمنڈا چلا آتا تھا۔ اور ہر گھر میں کہرام مچا تھا اور در و دیوار سے آہ و بکا کی صدا آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دستِ قضا نے اپنے فولادی ہاتھوں

سے سارے شہر کی بنیادیں ہلادی ہیں اور ہر گھر زوال آمادہ اور ہر متنفس موت کے منھ میں ہے، آہ موت، جس کے سوا ہر چیز جھوٹی اور ناقابل اعتبار ہے ؎

روّاں سوائے اجل اس جہانِ فانی میں   نہیں ہے اور کوئی شے یقین کے قابل!

مرنے سے کچھ دن پہلے ان چھٹیوں میں اُن سے کئی مفصل ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے میں اُن سے ملنے بار ایسوسی ایشن گیا۔ وکلا کے مجمع میں گھرے بیٹھے تھے، مجھے دیکھتے ہی حسب دستور بڑے تپاک سے مسکراتے ہوئے اُٹھے اور زور سے کرسی پیچھے ہٹا کر بڑے جوش سے "آیئے آیئے جناب لکچرار صاحب!" کہتے ہوئے مجھ سے گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ ہم علٰحدہ کمرے میں چلے گئے اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ علی گڑھ کے حالات، میری صحت کا حال، جگر صاحب[1] کے متعلق گفتگو، ۲۸ ستمبر کو اناؤ میں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا اُس کا ذکر، نیرنگ خیال[2] کے حصۂ نظم کی تنقید اور اس مضمون کے جواب پر اظہارِ رائے وغیرہ وغیرہ۔ کہنے لگے جس "دنداں شکن" جواب کی ایڈیٹر صاحب نے پچھلے نمبر میں دھمکی دی تھی وہ چھپ گیا۔ 'دنداں شکن' کیا معنی وہ تو 'کلہ شکن' اور 'کمر توڑ' ہے۔ اُسے پڑھ کر کوئی

---

[1] ان دنوں جگر صاحب کا قیام اناؤ میں روّاں کے گھر پر تھا۔

[2] رسالہ نیرنگ خیال، لاہور بابتہ اگست ۱۹۲۸ء میں اُس کے پچھلے سال نامہ کے حصۂ نظم پر ایک تنقید بلکہ تنقیص چھپی تھی کیونکہ معترض نے کسی شاعر کو، حتیٰ کہ علامہ اقبال کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس تنقید کے جواب کا پہلا حصہ اُسی رسالہ کے ستمبر نمبر میں شائع ہوا تھا۔

شخص جاں بر نہیں ہو سکتا۔ اُن کا مطلب تھا کہ ایک بے لاگ تنقید پر آخر آپے سے باہر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ علی گڑھ سے چلے آنے کے سبب یہ پرچہ میرے پاس نہ پہونچا تھا اس لئے انھوں نے وہ پرچہ مجھے گھر بھیجنے کا وعدہ کیا۔ (افسوس یہ پرچہ میرے پاس موجود ہے مگر اُس کا بھیجنے والا؟) اُنھیں کچھ ریاحی تکلیف رہتی تھی جس کے سبب کبھی کبھی یکایک اُنھیں چکر آجاتا تھا اور وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اُن کے احباب خائف رہتے کہ کسی دن یہ مرض رنگ نہ لائے۔ میں نے سنا تھا کہ پچھلے دنوں کچہری سے واپسی پر اُنھیں راستہ میں اس مرض کا ایک شدید حملہ ہوا تھا اس لئے میں نے اس کے متعلق استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شدت تو نہیں مگر مرض باقی ہے (تعجب ہے کہ موت بالکل دوسرے بہانے آئی) اس اثنا میں پان پر پان منگاتے رہے اور سگریٹ پر سگریٹ پیش کرتے رہے، اور شاید ہماری گفتگو کبھی ختم نہ ہوتی کہ ایک مؤکل نے مقدمہ زیر سماعت ہونے کی خبر سنائی، اور یہ "محفل برخاست"[1] ہوئی۔

شام کو ہمارے ہاں آئے۔ گرمی کے موسم میں شام کو نہا کر صاف

---

[1] میرؔ:

محفل برخاست ہے، پتنگے ق رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت، آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں

اُن کی بھی نمود ہے کوئی دم وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

دنیا کا یہ حال اور ہم کو کچھ فکر نہیں ہے، سو رہے ہیں!

شفاف ململ کے کُرتے اور باریک سفید دھوتی میں موٹر پر بیٹھ کر باہر نکلنا یا بے تکلف دوستوں سے ملاقات کرنا اُنھیں جی سے پسند تھا۔ اس لباس کو وہ ہندوستان کا قومی لباس بتاتے تھے۔ کہتے تھے کہ اسے پہن کر طبیعت میں فراخی پیدا ہوتی ہے۔ ہم جب فرصت میں یکجا بیٹھتے تھے دنیا بھر کی باتیں کرتے تھے۔ اُس وقت بھی یہی ہوا، ہم باتیں کرتے رہے۔ جب چاند ذرا بلند ہوا اور چاندنی چھٹکنے لگی اور فضا میں رومان و موسیقی کی کیفیت پیدا ہو چلی تو ہم لوگ اُٹھے، موٹر پر شہر سے باہر نکل گئے اور کئی میل کا چکر لگا آئے۔ یہ ہمارا دستور تھا۔ واپسی میں نہر پر آ کے بیٹھے۔ مگر پانی کم اور گندلا تھا اور طبیعت میں فرحت نہ پیدا ہوئی اس لئے اُٹھ کر چلے آئے۔

دوسری بار میں اُن کے گھر گیا۔ آواز دی "جگت!" جواب ملا "چلے آؤ جلیل" میں اندر گیا۔ قانونی کتابوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ فوراً کام چھوڑ دیا اور باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنی یونیورسٹی کے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے امتحانات اُردو کا نصاب دکھایا[۱]۔ غور سے بآوازِ پڑھتے رہے، خوش ہوئے، داد دی، بعض مشورے بھی دیئے۔۔۔ افسوس کیا خبر تھی کہ یہ دلچسپ ملاقاتیں آخری ملاقاتیں اور یہ پُر لطف صحبتیں آخری صحبتیں ثابت ہوں گی، اور صرف ان کی یاد سوہانِ روح کے لئے باقی

---

[۱] علی گڑھ یونیورسٹی میں اسی سال اُردو میں آنرز اور ایم۔ اے کی جماعتیں قائم ہوئی تھیں اور میں نے نئے نصابات تیار کرنے میں بڑی دلچسپی لی تھی۔

رہ جائے گی۔

جس وقت خیال آتا ہے کہ "ہائے وہ نور کی شکل اور وہ چہرہ شاداب![1] وہ قوی، بھاری اور آہنی بازو، وہ گھنی، لانبی اور نکیلی مونچھیں، وہ پہاڑ جیسا تن و توش اور وہ ان سب کا مجموعہ ایک انسان، ایک محشرِ خیال[2]" وہ مضبوط اور توانا شخصیت جسے دنیا چودھری جگت موہن لال رواںؔ، ایم اے، ایل ایل بی، اسسٹنٹ گورنمنٹ ایڈوکیٹ اُناؤ کے نام سے یاد کرتی تھی، وہ ایک نادر انسان —— انسان جس کے ساتھ شرافت، محبت، جذبِ احساس، تخلیق، تعمیر، تخئیل، تفلسف کا تخیل وابستہ ہے، انسان جو اس دنیا میں خدا کا نائب ہے، جس کی ہمت کی نسبت خود مرنے والے نے کہا ہے

زیرِ گامِ ہمت ہیں آدمی کے ہفت افلاک!

جس کی نسبت اُردو کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبالؔ کا ارشاد ہے ؎

قدسیوں نے بھی مقاصد میں جو ہے پاکیزہ تر   پھر یہ انساں، آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے   جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کیلئے مضراب ہے   جس کی نادانی صداقت کیلئے بیتاب ہے

جس نے دنیا کو ایک بازی گاہ بنا رکھا ہے، جو روئے زمین پر جنگ کرتا ہے، جس نے سمندر پر قبضہ کر رکھا ہے، جس نے ہوائی جہاز اور بے تار کی تار برقی، اور فوٹو

---

[1] رواںؔ پر میری ایک ناتمام نظم کا مصرعہ۔ یہ نظم کبھی مکمل نہ ہوسکے گی۔

[2] غالبؔ: ہر آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال   ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

گرافی اور ریلیں، اور کلیں اور اللہ ہی جانتا ہے کیا کیا اُلم غلم ایجادات کی ہیں ــــ وہ انسان آج قبر میں بھی نہیں ہے کہ اس تودۂ خاک ہی کو دیکھ کر دل کو تسکین دی جائے بلکہ ہندو رسم و عقیدہ کے مطابق اُس کی پہاڑ جیسی لاش کو جس کی بابت خود اُس نے کہا تھا ؎

اُٹھائے دیتے ہیں لاشہ مرا کہاں احباب — یہ آسمان نہیں اس زمین کے قابل!

لکڑی اور اوپلے اور گھی کے ساتھ جلا کر، اُسے خاک سیاہ کر کے، اُس کی کھوپڑی کو، جس کا اُسی کے بقول ؎

جنونِ سجدہ زمانے کی خاک چھان چکا — کہیں زمیں نہ ملی اس جبین کے قابل!

اور جو راکھ نہ ہو کر گویا جسم میں اپنی افضلیت کا مضحک ثبوت دینا چاہتی تھی، کچل کر، گویا اس کے پندار و تکبر کو توڑ کر، اُسے چُور چُور کر کے اس سارے ملغوبے کو گنگا جل کے سپرد کر دیا گیا اور معلوم نہیں وہ سب کہاں بہہ گیا، بہہ کر کہاں کہاں چلا گیا، جسے شاید کچھ زمین لے گئی کچھ آسمان[۱]، اور وہ ہنسنے ہنسانے والا، وہ اپنی مترنم آواز سے جس میں اشرفی کے سونے کی کھنکھناہٹ تھی، سامعین کو مسحور کرنے والا، وہ اپنی بڑی اور روشن آنکھوں کی چمک اور اُن کی سیاہ پتلیوں کی پھڑک سے دیکھنے والوں کو مبہوت بنانے والا رواں اب کبھی دیکھنے کو نہ ملے گا، بالکل نہ ملے گا۔ اُف جب ان سب باتوں کا خیال آتا ہے تو حیرت و عبرت کی آنکھیں کھل جاتی

---

[۱] رائگاں حسرت نہ جائے گا مرا مُشتِ غبار — کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائے گا

اور خدا یاد آتا ہے اور روح پھڑپھڑاتی ہے اور اُس دوسری دنیا کا بھید پالینے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ کوئی بتائے آج اپنے دوستوں پر جان چھڑکنے والا رواں کہاں ہے؟۔۔۔۔۔

میرے پیارے جگت! (کیونکہ اپنے حلقۂ احباب میں تم اسی نام سے پُکارے جاتے تھے) تم نے جیتے جی اپنے "آفاق گیر" تخیل سے کام لے کر اور اپنی روحانیت کی مدد سے اپنی نظموں، غزلوں اور سب سے زیادہ اپنی رباعیوں میں مسئلۂ حیات و ممات کو حل کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ہم جب کبھی تنہا بیٹھتے تھے تو بارہا اس مسئلے پر بحث ہوتی تھی۔ اب یہ مشکل ترین راز تم پر منکشف ہو گیا ہے، اس کے علم سے اپنے ایک عزیز دوست کو محروم نہ کرو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے اب بھی نہ بھولو، جس طرح میں تمھیں نہیں بھولا ہوں اور چپکے سے مجھے اس راز سے آگاہ کر دو؟۔۔۔۔۔

لیکن میں کہاں ہوں؟ میرا جگت کہاں ہے؟ ضرورت سے زائد تاثر کے باعث میں بہکنے لگا ہوں۔۔۔۔۔ آج اکتوبر کی بارہ تاریخ ہے۔ میں تعطیلات کے بعد علی گڑھ واپس آچکا ہوں، سوچتا ہوں، میں نے یہ سفر کیوں کیا تھا؟ دل کہتا ہے رواں کو رونے کے لئے! اس سفر میں گھر سے کیا ساتھ لایا؟ رواں کی مفارقت کا داغ جو جیتے جی میرے دل سے محو نہ ہوگا ؎

داغِ فراق دل میں امانت ہے عشق کی　　جب تک جئیں گے دل سے مٹایا نہ جائے گا!

(جلیل قدوائی)

میرے اور رواں کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ شاید بارہ تیرہ برس ہوئے میں اناؤ ہائی اسکول کا طالب علم تھا جب مجھ سے اُن سے شناسائی ہوئی۔ وہ اُس وقت بھی کافی اچھے وکیل اور شاعر تھے وکالت کے سبب وہ میرے محترم بزرگ خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم[1] وکیل و اسپشل مجسٹریٹ اُناؤ کے دوستوں میں تھے، میں ایک معمولی طالب علم تھا اور عمر میں اُن سے کوئی پندرہ برس چھوٹا، اس لئے ابتدا میں بہت تکلف اور حجاب رہا لیکن رفتہ رفتہ بالخصوص جب سے میں اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ آیا اور پھر مسلم یونیورسٹی سے میرا ملازمت کا تعلق ہو گیا ہمارے تعلقات بڑھ گئے اور اگرچہ علی گڑھ سے میرا اُناؤ جانا سال میں صرف چند بار، وہ بھی تھوڑے تھوڑے دنوں کے لئے ہوتا تھا، آہستہ آہستہ ہم دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے بے تکلف دوست ہو گئے، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ دوستوں میں بھی ایسی بے تکلفی کم ہوتی ہوگی۔ اُن کی زندگی اور گھر کے راز مجھ پر ظاہر تھے اور میری زندگی اور گھر کے واقعات سے وہ باخبر تھے۔ اُن کے گھر اور میرے گھر میں برادرانہ تعلقات تھے۔ آج اُن کی موت پر میرا گھر اور خاندان اسی طرح ماتم گسار ہے جس طرح

---

[1] میرے چچا بھی تھے اور حقیقی پھوپھا۔ اُناؤ کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ اگرچہ اُن کا ادب کا مذاق بہت بلند نہ تھا مگر اُن کے ہاں مشہور ادبی رسائل آتے تھے۔ میرے ادبی ذوق کی پرورش اُنہیں رسالوں اور مرحوم کی ہمت افزائی سے ہوئی۔ اُن کی تصویر نظر میں پھرتی ہے

ع ہائے کیا کیا صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں!

خود اُن کا خاندان۔ تعلقات کی یہی نوعیت ہے جس کے سبب رواںؔ کی موت مجھے ایک ذاتی حادثہ معلوم ہوتی ہے۔

رواںؔ انسانیت کا ایک نادر نمونہ تھے۔ وہ ہندو تھے مگر ایسے وسیع المشرب کہ اُن کے دل میں ہر مذہب کے آدمی کی محبت تھی بشرطیکہ وہ روشن خیال اور دل کا صاف ہو۔ در اصل اُنہیں مہاتما بدھ کی تعلیم و تلقین میں سب سے زیادہ صداقت نظر آتی تھی۔ اُن کو پڑھے لکھے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اور اُن سے تبادلۂ خیال کرنا خصوصاً مذہبی معاملات میں بے حد پسند تھا۔ میرے علاوہ اُن کے بعض اور گہرے دوست مسلمان ہیں۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے اثرؔ صاحب[1] اور یعقوبؔ صاحب[2] سے ملنے کے خیال سے وہ ہردوئی اور سانڈی جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اُن کا ساتھ نہ دے سکا اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔

گاندھی جی کے بڑے پرستاروں میں تھے اور ملک کو جلد سے جلد آزاد دیکھنے کے آرزومند۔ گو اپنی مجبوریوں سے اُن کی "گوپیوں"[3] میں شامل نہ تھے مگر

---

[1] مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، ڈپٹی کلکٹر ہردوئی مشہور شاعر و نقاد، کبھی اُناؤ میں تھے۔

[2] اُناؤ کے سب سے بڑے رئیس و تعلقہ دار جناب چودھری محمد ماہ صاحب جن کا خاندان اودھ کے مسلمان شرفا و سادات میں چوٹی کے خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اُن کے داماد سید یعقوبؔ حسن صاحب آپ سانڈی ضلع ہردوئی اور رائے پور کے رئیسوں میں سے ہیں نہایت ذہین و طباع ہیں اور اردو شعر و ادب میں اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔

[3] مدخولۂ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

جب کبھی کوئی خاص خبر آتی یا جلوس وغیرہ نکلتے یا گرفتاریاں عمل میں آتیں تو اُن کا چہرہ فرطِ خوشی سے چمک اُٹھتا تھا اور خون جوش مارنے لگتا تھا جیسے ایک شیر زنجیر تڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اکثر ایسے وقت میں فخریہ اور پُر جوش اشعار پڑھتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔

اپنے بزرگوں کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا لیکن وہ اپنے بڑے بھائی بابو کنھیا لال صاحب کو اُن سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ میں نے اُن کے ہاں اچھے بڑے آدمیوں کو آتے دیکھا، کسی کے لئے وہ اپنی آرام کرسی نہیں چھوڑتے تھے مگر ان بھائی صاحب کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کو اپنی آرام کرسی پر بٹھاتے تھے اور اُن کے پیر چھوتے تھے اور ہاتھ جوڑتے تھے اور بالکل بچھ جاتے تھے۔ اسی طرح اپنے چھوٹے بھائی بابو تربھون ناتھ صاحب کو جو کانپور میں وکالت کرتے ہیں بہت چاہتے تھے اور اگر کچھ عرصہ تک اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور کام سے فرصت نہ ملتی تو راتوں رات موٹر سے جا کر انھیں دیکھ آتے تھے۔

اپنے بچوں سے ہر باپ کو محبت ہوتی ہے مگر اُن کی محبت ظاہری نہیں باطنی تھی۔ بظاہر وہ اُن سے بے تعلق رہتے تھے یا زیادہ سے زیادہ اُن سے دوستانہ سا برتاؤ رہتا مگر اُن کی ذرا سی تکلیف سے بے چین ہو جاتے تھے اور اُن کی بیماری کے زمانہ میں رات رات بھر جاگ کر اُن کی تیمارداری کرتے۔ جس رات شکار کے لئے مجھ سے بات چیت ہوئی ہے اُسی رات کا واقعہ ہے

کہ اُن کے منجھلے لڑکے ہرگیان نے جس کی عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی اُن کے پاس آکر اُن کے کان میں کچھ کہا۔ سن کر زور سے ہنسے اور کہا "ضرور ضرور" مجھ سے پوچھا" جانتے ہو کیا کہتا ہے؟ اپنے بعض دوستوں کو اس نے کھانے پر بلایا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ کھانے کے میز اور کرسیوں پر کھلانے کی اجازت دیدوں" یہ کہہ کر اپنی پاٹ دار آواز سے پکارا" مہرا! ہرگیان بابو کیلئے کھانے کے کمرے میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دو۔ دیکھو انھیں کوئی تکلیف نہ ہو" اس بچے کو غالباً سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اکثر کہتے "یہ بہت شاندار ہوگا۔ اس کی آن بان اور اس کے ٹھاٹھ بالکل اپنی ماں کے سے ہیں!"

بہ حیثیت فوجداری کے ایک وکیل کے وہ اس اناؤ میں چوٹی پر تھے۔ اُن کی قانونی قابلیت کے متعلق میں ایک ماہر کی حیثیت سے رائے نہیں دے سکتا اس لئے کہ میری اپنی قانونی قابلیت اس حد تک مشتبہ ہے کہ کئی سال کی متواتر کوششوں کے باوجود وکیل نہ ہوسکا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اناؤ بار ایسوسی ایشن کے تمام وکلا، حتیٰ کہ خود اُن کے اُستاد اور فوجداری کے وکلا کے میر لشکر رائے بہادر چودھری جگناتھ پرشاد صاحب سابق ام، ال، سی، بھی اُن کی قانونی قابلیت اور معلومات کے معترف و مداح تھے۔ ایک عامی انسان کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے پاس ایک بڑا قانونی کتب خانہ تھا۔ ذہن و دماغ اس قدر رسا اور دُور رس پایا تھا کہ اشارہ پاکر بات کی تہہ کو پہونچ جاتے تھے۔ بڑے محنتی تھے اور اپنے شاگردوں سے بھی ویسی ہی محنت کی توقع کرتے تھے۔ اکثر شکایت کرتے تھے کہ نوجوان وکیل

محنت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کی راہیں اس پیشہ میں بند ہو گئی ہیں۔ نئے وکیل سستے مقدمات اور کم محنت پر قانع ہو جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر اُنھیں سستے مقدمات ہی ملتے ہیں اور وہ معمولی درجہ کے وکیل سے آگے نہیں بڑھتے۔

جاننے والے شاہد ہیں کہ اُنھوں نے اپنے پیشہ کی عزت کو قائم نہیں بلکہ اُناؤ میں اس پیشہ کی عزت کی کم و بیش بنیاد ڈالی اور دوسرے وکلا کے لئے نمونہ بنے۔ حکام وقت سے راہ و رسم بڑھا کر، بیجا اثرات سے کام لیکر، اُن کی خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعہ اپنے پیشہ کو فروغ دینا ان کے قانونی مذہب میں کُفر تھا۔ اُنھوں نے محض اپنی محنت، لگاتار محنت اور قابلیت سے ترقی حاصل کی۔ اُن کے پیشہ کے فروغ کی نسبت یہ عرض ہے کہ اس بارہ تیرہ برس کی ملاقات میں جب کبھی میں اُن کے ہاں گیا کم ایسا ہوا کہ میں نے اُن کی آرام کرسی کے ہتھے پر روپیوں کی گڈیاں رکھی ہوئی نہ دیکھی ہوں۔ اور ایسا تو ایک دفعہ بھی نہیں ہوا کہ اُنھیں بغیر سائلوں کے پایا ہو، بلکہ مجھے یہ حسرت رہی کہ کبھی اُن سے مسلسل گھنٹہ دو گھنٹہ سائلوں سے بے خوف اور فارغ ہو کر گفتگو ہو سکتی۔ ہاں جب میرے مکان پر ہوتے یا سیر و سفر میں، اُس وقت ظاہر ہے کہ یہ کلیہ قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی چھٹی میں ہمارا باہر جانے کا پروگرام ہے۔ وقت معینہ پر موٹر پہونچی کہ بُلایا ہے۔ پہونچا تو معلوم ہوا کہ کسی آنریری مجسٹریٹ کے اجلاس کا مقدمہ آیا ہوا ہے اور باہر گئے تو بیچارے کا پچاس ساٹھ روپیہ کا نقصان ہوگا۔ مجبوراً پروگرام ملتوی کیا گیا

مگر چونکہ میں بھی قانون پڑھ رہا تھا مجھے ساتھ ضرور لے جاتے تھے کہ مجھے کچھ کام ہی آجائے۔

لیکن کثیر آمدنی کے باوجود وہ پیسہ کو جوڑنا نہیں جانتے تھے۔ ہاں زندگی کا بیمہ ضرور کرا یا تھا۔ کچھ کرایہ کی دوکانیں ہیں۔ بس۔ طبیعت نہایت فیاض اور شاہ خرچ واقع ہوئی تھی۔ بال بچوں، عزیزوں، دوستوں اور نوکروں پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں بھی خوشی خوشی روپیہ دیتے تھے۔ لیکن وہ نام و نمود سے بھاگتے تھے اس لئے کھلے خزانے کسی تحریک کو لیکر میدان میں نہیں آتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ عمدہ لباس پہنتے تھے۔ اُناؤ میں میرے علم میں رواں سے بڑھ کر قیمتی اور بہترین سلی ہوئی شیروانیاں کسی نے نہیں پہنیں۔ ان کی بیگم صاحبہ حیدرآباد کی رہنے والی تھیں، اس لئے بعض دفعہ شیروانیاں براہِ راست وہاں سے سل کر آتی تھیں۔ آخر آخر آرام طلب ہو چلے تھے جو اُن کی ابتدائی مشقت و دلسوزی کا انعام تھا۔ پھر عمارت بنوانے اور باغ لگانے کا بھی شوق تھا۔ روپیہ آتا تھا اور عمارت پر صرف ہو جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ کا یہ شعر بارہا اُن کی زبان سے سنا ؎

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے عمارت بناتے چلے جایئے

ان کے زنانہ مکان، مردانے حصے، دوکانات اور باغ وغیرہ پر اس میں شک نہیں کوئی چالیس پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ دو دو موٹریں رکھ چھوڑی تھیں جن پر علاوہ کچہری جانے کے جی کھول کر تفریح کرنے بھی جاتے تھے۔

اور اپنے احباب کو بھی خوب سیر کراتے تھے۔

میں جب چھٹی میں جاتا، دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اس آرام و آسائش کے جو اللہ نے انہیں دے رکھا تھا اور باوجود اپنے پیشے کے ساتھیوں کے انھیں زندگی میں سچے دوست بہت کم ملے تھے۔ خصوصاً وہ ایسے دوست کے طلب گار تھے جو قانون، اور عدالت، اور جرم اور سزا، اور مکر اور دغا، اور مار پیٹ اور تعزیرات ہند کے علاوہ اُن سے بات کرے اور اُناؤ میں انھیں یہی چیز عنقا تھی۔ اکثر مجھ سے کہتے کہ وہ بڑا مُبارک دن ہوگا جب تم وکیل بن کر آؤ گے۔ اُنھیں خیال تھا کہ۔ ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ میں وکیل نہیں ہوا، نہ صرف یہ بلکہ وہ کبھی کبھی کا "مل بیٹھنا" بھی گیا۔

شاعر تھے اور علم و ادب کے عاشق زار۔ میں نے کسی وکیل میں جو اپنے پیشہ میں بھی چوٹی پر ہو، علم و ادب کا ایسا چسکا نہیں پایا۔ دراصل وہ علمی مشاغل ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے مگر قدرت کی ستم ظریفی نے اُنھیں وکیل بنا دیا۔ کہا کرتے تھے کہ "قدرت نے وکالت کے پیشہ سے پیٹ بھرنا تقدیر میں لکھ دیا ورنہ اس کام سے میری روح گھٹتی ہے اور اوقات کشی کرتا ہوں!" ادب کی کتابیں اگرچہ کم خریدتے تھے مگر کتاب مل جانے پر اُسے حریصانہ پڑھتے تھے۔ جب چھٹیوں میں اُن سے ملتا نئی کتابوں کا تقاضا کرتے اور جو کتابیں میرے پاس ہوتیں اُنھیں مستعار لیکر پڑھ ڈالتے تھے۔ اُناؤ میں کوئی اچھا

ادبی کتب خانہ نہیں ہے اس لئے کبھی کبھی میں نے اُنھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری سے بھی کتابیں مستعار لیکر بھیجیں۔ اپنا ذاتی ادبی کتب خانہ مہیّا کرنے کا بھی ارادہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ سے اوّل درجہ کے ایم۔ اے تھے اور بہترین انگریزی شعرا کا بہت سا کلام زبانی یاد تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جدید انگریزی شعرا و مصنفین اور نئی ادبی تحریکات سے کم واقف تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں گالزوردی کے SKIN GAME کے ترجمہ[1] میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کبھی ترنگ میں آکر انگریزی نظم کو اُردو غزل کے انداز سے ترنم کے ساتھ اس طرح پڑھتے تھے کہ لطف آجاتا تھا۔ یہ اُن کا ایجاد تھا۔ یہ بات اگر کسی اور کی بابت کوئی کہتا تو میں اسے بدمذاقی کی دلیل سمجھتا مگر رواں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے اور میں نے سچی بات کہی ہے۔ ٹامس مور کی DEAR HARP OF MY COUNTRY کی صدا میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ شکسپیر، ملٹن، بائرن، ٹنی سن اور براؤننگ سے خاص شغف تھا۔ فٹز جیرلڈ کی "رباعیات عمر خیام" کو ادبی معجزہ سمجھتے تھے۔ سر ایڈون ارنلڈ کی LIGHT OF ASIA تو تعویذ کی طرح ہر وقت ساتھ رہتی تھی اس لئے اور بھی کہ ان دنوں گوتم بدھ کی زندگی اور اُس کی تعلیم پر اُردو میں ایک مثنوی لکھ رہے تھے۔ فارسی کا مذاق بے انتہا پاکیزہ تھا، بالخصوص حافظ اور خیام کے تو پرستار تھے۔

---

[1] اس ڈرامہ کا اُردو ترجمہ "فریب عمل" کے نام سے ہندستانی اکیڈمی یو۔ پی۔ الٰہ آباد نے شائع کیا ہے۔

ان دونوں شعرا کا اثر اُن کی رباعیوں میں نظر آتا ہے۔ خیام کی چار رباعیوں پر جو تصویریں زمانہ ہوا انگریزی اخبار ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA میں شائع ہوئی تھیں اُنھیں بڑے اہتمام سے فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کیا تھا۔

اُردو اور ہندی تو اُن کی مادری زبانیں ہی تھیں۔ ہندی میں بہاری لال اور رحیمن کے دوہے مزے لے لیکر پڑھتے تھے اور اُن کے لطف کو بڑے لطف سے بیان کرتے تھے۔ اُردو میں غالبؔ کو چوٹی کے شعرا میں جگہ دیتے تھے۔ سوداؔ کی طنزیات کے قائل تھے اور اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ اُردو شاعری میں کوئی سوداؔ کا متبع نہیں پیدا ہوا۔ منشی دیا شنکر نسیمؔ اور سرشارؔ کے کمال کے بہت مداح تھے، اور سُرورؔ جہان آبادی، اکبرؔ الہ آبادی اور دورِ حاضر کے شعرا میں اقبالؔ کے خاص طور پر دلدادہ تھے، آثرؔ صاحب کے معترف تھے خصوصاً اُن کی تنقید کے۔ آج کل کے غزل گو شعرا میں اصغرؔ اور عزیزؔ کا کلام دل سے پسند تھا۔ عزیزؔ لکھنوی صاحب کے شاگرد تھے اور اگرچہ اصلاح و مشورہ عرصہ سے بند تھا تاہم اُن سے برتاؤ آخر دم تک نہایت سعادت مندانہ تھا۔ اُستاد کا بیحد احترام کرتے تھے اور ان سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کی زبان کی معلومات کے دل سے قائل تھے۔ انھیں بیمار یا تکلیف میں سُن کر بے قرار ہو جاتے تھے اور ہر طریقہ سے آرام پہونچانے کی فکر کرتے تھے۔ جگرؔ صاحب عرصہ تک اُن کے ہاں ایک دوست کی حیثیت سے مقیم رہے۔ اُنھیں دنوں اثرؔ صاحب بھی اناؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور جب

چھٹیوں میں یہ خاکسار بھی پہونچ جاتا تھا تو شعر و سخن کی بڑی پُر لطف صحبتیں رہتی تھیں۔ رواں کی وجہ سے اُناؤ میں کئی بہت بڑے اور شاندار مشاعرے ہوئے۔ جگر کو وہ مثل اپنے بھائی کے سمجھتے تھے اور اُن کے کلام کو والہانہ انداز سے سنتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ کہتے تھے اُردو میں ایک ہی شاعر ہے جس کی زندگی اور شاعری ایک ہے۔ جگر شاعری "برتتا" ہے، دوسرے شاعری "کرتے" ہیں۔ ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اُن کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھتے تھے۔ مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے۔ میری وجہ سے علی گڑھ کے مشاعروں میں شریک ہوئے اور باوجود کثرتِ کار اور مالی نقصان کے میرے اصرار پر جو ایک عزیز دوست کے پاسِ خاطر سے تھا ڈبائی ضلع بلند شہر کے ایک مشاعرہ کی صدارت کی۔

طبیعت ایسی رندانہ بلکہ قلندرانہ پائی تھی کہ شعر و ادب کی بات چیت میں کھانا پینا بھول جاتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے آٹھ بجے کا وقت ہے، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اُن کی کوٹھی میں یا باغ میں ہماری پُر لطف صحبت جمی ہوئی ہے کہ طبیعت میں ہیجان بلکہ طغیانِ احساس اُٹھا اور ہم موٹر پر یک دم سوار ہو کر کسی طرف چل دیئے۔ ایک پُرانی کملی، دو ایک تکیے، پانوں کا ڈبہ، قوام کی شیشی اور سگریٹ، یہ زادِ راہ ہوتا۔ جس مقام پر فضا خوشگوار اور وسیع دیکھی، جہاں بے دھڑک، بے دریغ، بے تکان باتیں ہو سکیں اور دنیا کی کوئی چیز ہمارے اس فرض کی ادائگی میں مانع نہ ہو موٹر روک دی گئی۔ میدان میں کملی بچھا دی گئی اور تکیوں کے سہارے پڑ کر ہم نے

باتیں شروع کردیں۔ دنیا بھر کی باتیں، کہ اگر کوئی اور سنے تو ہمیں دیوانہ، پاگل سمجھے ۔۔۔۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے یا یوں کہئے کہ دیوانگی سے عالم ہوش میں آئے تو رات کے بارہ ایک بجے تک گھر واپس آگئے۔ کچھ نہیں تو کانپور کا چکر کاٹ آئے۔ سینما دیکھا، نہ دیکھا تو سارے شہر کا گشت لگایا، گنگا گھاٹ کے پُل پر چاند کا نظارہ کیا، گنگا جل کی روانی دیکھی اور چاندنی کی سیر کی۔ وہ تیز ہوا ہوتی تھی کہ الامان۔ کہتے بھی جاتے تھے کہ پُل پر سے کل ایک بڈھا اپنی چھتری کے ساتھ ہوا کے زور میں غرقِ آب ہو گیا مگر ہم خود پُل پر سے نہ ہٹتے تھے۔ بے فکری کی انتہا ملاحظہ ہو کہ اُس وقت سوامی رام تیرتھ کی موت، زندگی، سفر، سیاحت اور تلقین کا ذکر چھڑ جاتا یا شیلی کی زندگی و موت کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ --- اس وقت فطرت مُسکراتی ہوگی کہ کچھ دن بعد اسی گنگا گھاٹ پر اس کی لاش کشاں کشاں لائی جائے گی اور اس کی خاک گنگا جل کے نذر ہوگی ——

ایک دن ہمیں ایک لفظ کی تحقیق منظور تھی۔ فرہنگ آصفیہ یا نور اللغات کی بہت تلاش کی مگر اُناؤ میں یہ کتابیں کہاں۔ جھٹ موٹر لی اور کانپور پہونچے۔ گیا پرشاد لائبریری میں داخل ہوئے، لغات دیکھ کر اپنی تشفی کی اور اسی دم اُناؤ واپس چلے آئے۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کئی دفعہ ہم لوگ لکھنؤ چل دیئے۔ عزیز صاحب سے مل آئے۔ حضرت گنج اور امین آباد کی سیر کی، کچھ خریداری کی۔ تماشا دیکھا یا بالا پرشاد کے ہاں کی آیس کریم اُڑائی اور چلے آئے ۔۔۔ ہائے کیا زمانے تھے۔ میری اس بکواس کا کوئی صحیح لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ تو جس پر گزری ہو وہی جانے ہے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی!

ان سفروں میں راستہ بھر ہم لوگ اپنے یا جگر کے کلام کا دیوانوں کی طرح کورس گاتے آتے تھے۔ راہ میں بیسیوں بیل گاڑیاں، موٹریں، لاریاں، یکّے یا پیدل چلتے ہوئے مسافر ملتے تھے۔ مگر ہم اپنے کو اس دُنیا کا بسنے والا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہمیں بیوقوف کہتے ہوں گے، مگر ہم سمجھتے تھے کہ اس وقت ہمارے سوا تمام دنیا ایک بہت بڑا حرفِ غلط تھی!۔۔۔۔۔

رَواں کی شاعری کے متعلق اتنا کہنا ہے کہ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک مفکّر، خصوصاً اُردو میں جو رباعیاں اُنھوں نے لکھی ہیں وہ اپنے رنگ میں جواب نہیں رکھتیں۔ اُن کی طبیعت نہایت فلسفیانہ اور غور انگیز واقع ہوئی تھی اور کوئی خیال جو اُن کے دل و دماغ بلکہ رُوح میں رچ نہ جائے وہ اسے نظم نہیں کرتے تھے۔ طبیعت کی یہ غور انگیزی ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں برابر جھلکتی ہے۔ دُنیا کے ہر بڑے فلسفی شاعر کی طرح موت اور زندگی کے مسائل سے اُنھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص ساری زندگی اسی سوچ بچار میں رہا کہ آخر ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟ وہاں کیوں جائیں گے؟ یہاں کسے کہتے ہیں؟ وہاں کون سا عالم کہلاتا ہے؟ کیا موت قاطعِ حیات ہے؟ نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل اُن کے "دل کی آواز" معلوم ہوتے ہیں اور انھیں سوالات اور انھیں ذہنی اُلجھنوں کو وہ اپنے اشعار میں بار بار پیش کرتے ہیں اور ایک خشک فلسفی

کی زبان میں نہیں بلکہ ایسی زبان میں جسے، اگر اس محاورہ سے میرا مفہوم واضح ہو جائے، کوثر کی دُھلی ہوئی زبان کہہ سکتے ہیں، ؎

قبر تک لائی ہے احباب کی تدبیر مجھے آگے لیجائے کہاں دیکھئے تقدیر مجھے
نظمِ ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک خوابِ جنوں کون بتلائے مرے خواب کی تعبیر مجھے
سدِّ انوارِ حقیقت ہے مرا پردۂ زیست توڑ دینا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے

نزع میں آکر کھلا ہے عالمِ فانی کا راز اے مری جاتی ہوئی دُنیا بڑا دھوکا ہوا
اور اب کوئی ورق اے کاتبِ تقدیر اُلٹ اُس کو کیا دیکھوں جو ہے سو بار کا دیکھا ہوا [۱]

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر اُف قیدِ زیست روح کے آزاد ہونے کو زمانہ چاہیے
اقتضائے نظمِ ہستی ہے یہ نیرنگِ نمود زندگی اور موت کا دھوکا نہ کھانا چاہیے
رنج و راحت کی کشاکش میں بہت مدت ہوئی کچھ تو اے دل اب قدم آگے بڑھانا چاہیے

فکرِ عقبیٰ کی کریں یا ہم غمِ دُنیا کریں عقدۂ ہستی کو کس ناخن سے آخر وا کریں
ایک عالم محوِ نظارہ ہے اور وہ پردہ دار گر اسی کا نام پردہ ہے تو وہ پردا کریں
جانے والے چل دیئے دُنیا کی بستی چھوڑ کر رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں

۱؎ اقبال:

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی!

اگر کچھ روز زندہ رہ کے مرجانا مقدر ہے — تو اس دنیا میں آخر مقصدِ تخلیقِ جاں کیا تھا
یہی ہستی، اسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے — وگرنہ ایسا پردہ میرے اُن کے درمیاں کیا تھا

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے — یہی قانون فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے
کوئی آزاد ہستی بزم دنیا میں نہیں ملتی — جسے دیکھیں گے بس فریادی زنجیر دیکھیں گے

اپنے وطن سے چھٹ کر آوارہ پھر رہا ہوں — بانگِ غریب منزل، نامحرم درا ہوں
دیوانگی سمجھئے یا میری کم نگاہی — اپنا نشانِ منزل اوروں سے پوچھتا ہوں
اللہ ری دل فریبی ایوانِ آرزو کی — ہر منظرِ فنا کو باقی سمجھ رہا ہوں
آتا ہوں فاصلے سے جانا ہے دُور مجھ کو — دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

مسافر ہوں زیادہ اور اس سے کہہ نہیں سکتا — کہ آتا ہوں کہاں سے اور جانا ہے کہاں مجھکو
مآلِ زندگی ہے کام کرنا کام کرتا ہوں — تاسف ہو اگر ہو کاوشِ سود و زیاں مجھکو

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے — خوشی کیا چیز ہے دنیا میں، غم کیا

کہاں سے کہاں لائی قسمت مری — کس آفت میں میں مبتلا ہو گیا

ہستی مجھے خود اپنی معما ہے اے رواں — آزاد بھی نہیں ہوں گرفتار بھی نہیں

معمّا ہے جنھیں خود اپنی ہستی بزمِ عالم میں
وہ کم اندیش شرحِ عالم ایجاد کیا کرتے
بہر تقدیر کچھ دن کاٹنا تھے قیدِ ہستی کے
قفس برباد کر کے آشیاں برباد کیا کرتے

ضایع ہے نقدِ ہستی، برباد گفتگو ہوں
ڈھلکی ہوئی صراحی چھلکا ہوا سبو ہوں
مجھ کو بتا خدایا ہستی کا میری حاصل
آخر میں کس کا مقصد میں کس کی آرزو ہوں

بساطِ دہر میں مانندِ مہرۂ شطرنج
نہ جانے کس لئے سرگرمِ کارزار ہوں میں
جہاں میں صورتِ فوّارہ زندگی ہو مری
کہ آپ اپنی بلندی پہ اشکبار ہوں میں

گلِ ایک غنچہ نے بادِ سموم سے یہ کہا
ہزار بار خزاں اس چمن میں آئی ہے
نہ گل ہوئی ہے نہ شمعِ حیات گل ہوگی
ہزار بار یوں ہی انجمن میں آئی ہے

مندرجۂ بالا انتخاب نہایت سختی سے اور طبیعت پر بہت جبر کر کے کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے اور نہ معلوم کتنے اشعار ترک کر دیئے گئے۔ موت و حیات کے مسائل پر ہر ذی فہم سوچتا ہے، ہر شاعر نے اپنی اس ذہنی ورزش کی یادگاریں اپنے دیوان میں چھوڑی ہیں۔ لیکن یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ "روحِ رواں"[۱] کے ایک حصّہ کے صرف بیس اوراق میں اور غزل جیسی صنف میں جو عشق و عاشقی کے پامال مضامین کے لئے بدنام ہے بار بار، اور اصرار کے ساتھ ان مسائل کا ذکر ہی نہیں اس

۱؎ مجموعۂ کلام چودھری جگت موہن لال رواںؔ

قدر جاندار طریقہ پر ذکر آنا "خالی از علت" نہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے مرکزی خیالات ہیں۔ یہ اس کی روح کی بیتابی اور جد وجہد کی روشن دلیل ہے! نہ صرف یہ بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ شاید کیا ہندو کیا مسلمان، اور کیا لکھنؤ کے شعرائے باکمال، کیا دہلی کے اُستادانِ نازک خیال، کسی ایک شاعر کے دیوان میں ان مسائل پر نہ صرف اس نسبت سے بلکہ اس کثرت سے اور ایسے واضح و روشن اشعار نہ ملیں گے۔ شاید تمام غزل گو شعرا میں باوجود میت و جنازہ کے سطحی اور رسمی مضامین کے رواںؔ سے زیادہ کسی شاعر نے ان مسئلوں پر ٹھنڈے دل سے اور مسلسل غور نہیں کیا۔ شاید اس کی ساری زندگی انہیں اُلجھنوں کی نذر ہوئی۔ اس لحاظ سے رواںؔ اپنی آپ مثال ہیں اور اُردو شاعری میں ان کا خاص درجہ ہے۔

اُن کی رباعیوں میں بھی انہیں موضوعات کی تکرار ہے ؎

بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی
یہ گُل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا

ہستی پابندِ مُل نہیں ہونے کی
یہ ہستیٔ جزو کُل نہیں ہونے کی
یہ شمعِ حیات گُل نہیں ہونے کی
محفل بدلے، لگن بدل جائے مگر

ہم راہ روؤں کو رنجِ غربت یہ ہے
ہے چشمِ حواس کور، آفت یہ ہے
اس کی بھی خبر نہیں مصیبت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں

پائندگیٔ ذوق اہل دل کیا معنی! دل چسپیٔ جنس مضمحل کیا معنی!
اے ناظمِ کائنات کچھ تو بتلا آخر یہ طلسمِ آب و گِل کیا معنی؟

ہے گرم ہر ایک سمت بازارِ فنا ہے دارِ حیات سر بسر دارِ فنا
لیکن کیوں کر جہاں کو فانی سمجھوں ذرّے کو بھی جب نہیں ہے اقرارِ فنا

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا ہو جائیں گے اب تمھارے انوار فنا
تاروں نے کہا کہ ہم رہیں گے یوں ہی تو آئے گی اور ختم ہو جائے گی، آ

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

تم تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو شاید یہ قلم ہی نخلِ بار آور ہو
مقراضِ اجل ہے قاطعِ شاخِ حیات ممکن ہے اسی میں رازِ جاں مضمر ہو

سرمایۂ جان و دل ہے مستی میری ہے وجہِ بقا فنا پرستی میری
ورنہ اس گنبدِ تعین میں رواں اک نالۂ رائگاں ہے ہستی میری!

ان مثالوں سے نہ صرف شاعر کی قوتِ نظم، قدرتِ بیان اور بلندیٔ تخئیل کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس فراغتِ اطمینان کے جو قدرت

نے رواں کو زندگی میں عطا کر رکھے تھے اُن کی روح ہمیشہ بیچین رہی، کہ رواں کی ہستی اس فانی دنیا میں باہمہ اور بے ہمہ تھی - ان نمونوں میں اگر اس غزل کو بھی شامل کر لیا جائے جس سے میں نے اس مضمون کی ابتدا کی ہے تو اس خیال کو پوری پوری تقویت پہونچتی ہے کہ ہر چند رواں سب سے ملتے جلتے رہے، دُنیا کی ہر ادا سے لطف اندوز ہوتے رہے، اُنھوں نے کھایا، پیا، عیش کیا، غرضکہ ہر طرح فارغ البال زندگی گزاری مگر اُن کی تنہائی میں خوشی و یکسوئی نہ تھی اور یہ دنیا درحقیقت زیادہ حساس لوگوں اور سوچ بچار کرنے والوں کو راس بھی نہیں آتی، رواں کی دو اور رباعیوں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

اسبابِ جہاں سے دل کو بہلائیں ہم
اس طرح کا دل بھلا کہاں پائیں ہم
خلوت میں بھی حیف دل کی ایذا ہی دہی
اب اپنے سے بھاگ کر کہاں جائیں ہم

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکر فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

کیا اب بھی اُن کی روح کی بیچینی کے متعلق شبہ ہو سکتا ہے؟ شاید اُن کی ساری رباعیوں میں اُن کے اصلی رنگ طبیعت کی ایسی غماز رباعیاں نہیں مل سکتیں - یوں بھی رباعی میں وہ اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے تھے - اور اس میں شک نہیں کہ تمام اُردو شاعری میں بیحد مترنم، پُر جوش، سانچے میں ڈھلی ہوئی اور عمیق خیالات و جذبات سے مالا مال گویا سچی اور صحیح معنوں میں رباعیاں صرف رواں نے لکھی ہیں - ان کا نام بحیثیت رباعی کے ایک مجدد کے ایک دن

لازوال شہرت حاصل کر کے رہے گا۔۔۔۔

کئی سال ہوئے رداں نے مجھ سے ایک دوستانہ شکایت کی تھی۔ میں نے اپنے افسانوں اور شعر و شاعری کی کتابوں کے انتساب کے سلسلہ میں اپنے کئی محسنوں اور دوستوں کا نام لیا تھا مگر انھیں کہیں یاد نہیں کیا تھا۔ مجھ سے یہ شکایت کی گئی تو میں نے اپنے دل کو بہت ہی ٹٹولا مگر اس بھول کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ندامت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ آیندہ کسی بہتر طریقہ پر حق دوستی ادا کروں گا۔۔۔۔ اگر اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ایک دن مجھے حق دوستی یوں ادا کرنا پڑیگا تو میں وہ الزام اپنے سر لیتا لیکن ہرگز ہرگز ایسا وعدہ نہ کرتا۔ مگر انسان مستقبل سے بے خبر ہے اور کارپردازان قضا و قدر کا انتظام اس کی سمجھ سے باہر۔۔۔۔۔

یہ دُکھڑا بہت طویل ہو گیا مگر ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

بادلِ ناخواستہ اس دُکھڑے کو اپنے دوست کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

دل کے داغوں میں جھلک اُنکی نظر آتی ہے اب
پھول سی جو صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں!

لیکن یہ صرف میرے لئے ہے، مجھے اُن کا ایک شعر اور یاد آیا ؎

اگلی صحبتیں ساری خواب کی سی باتیں ہیں
دوستوں سے ملنے کو روح اب ترستی ہے!

یہ دونوں کے لئے ہے۔ کیونکہ اگرچہ اب ہم اُن کی نگاہِ التفات کے سزاوار نہیں مگر کیا عجب کہ ہمارے دوست کی روح کو ابھی اس دنیا کی یاد باقی ہو اور یہی حسرت اُدھر بھی ہو۔

(الناظر لکھنؤ دسمبر ۱۹۳۴ء)

اقبالؔ کا ایک شعر

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

اقبالؔ کا یہ شعر عطیہ بیگم کے نام خطوطِ اقبالؔ کے مجموعہ میں شامل ہے جو انگریزی میں ہے اور جن میں سے چند کا اُردو ترجمہ رسالۂ نگارؔ لکھنؤ کے جولائی ۱۹۵۶ء نمبر میں شائع ہوا ہے۔ مندرجہ بالا شعر اس ترجمہ میں بطور آخری خط کے درج ہے جو اقبالؔ نے موصوفہ کو ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لکھا تھا۔ اس شعر کی "فنی حیثیت" سے متعلق نیازؔ فتحپوری صاحب نے نگارؔ کی اسی اشاعت میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں :-

"پہلے مصرع میں جب جوشِ جنوں یعنی جوشِ دیوانگی کا اعتراف کرلیا گیا تو پھر دیوانہ بننے یا نہ بننے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ "کہئے کیا حکم ہے دیوانہ رہوں یا نہ رہوں؟" تو البتہ درست ہوسکتا تھا۔ اور اگر دوسرا مصرع بدستور رکھا جائے تو پہلے مصرع میں لفظِ "جنوں" نہ ہونا چاہیئے۔ یہ مصرع

یوں ہو سکتا تھا۔ ع

عالمِ جوشِ محبّت میں سبھی کچھ ہے روا

حالانکہ لفظ "عالم" دونوں صورتوں میں بے ضرورت ہے"۔

میرے خیال میں اس شعر پر رائے ظاہر کرنے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ اگر اقبال کے مصرع، ——— عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ ——— کے بعد "دیوانہ بننے یا نہ بننے کا سوال باقی نہیں رہتا" اس لئے کہ "پہلے مصرع میں جوشِ جنوں کا اعتراف کر لیا گیا" ہے تو مجوزہ مصرع ——— کہئے کیا حکم ہے دیوانہ رہوں یا نہ رہوں، کے متعلق بھی قائل کہہ سکتا ہے کہ دیوانہ رہنے یا نہ رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جب جوشِ جنوں مسلم ہو گیا تو جس وقت تک شاعر دیوانگی ترک کر کے عالمِ ہوش میں نہ آئے وہ یہ سوال نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے علاوہ ع ——— "عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ" ——— کے ساتھ مجوزہ مصرع مہمل بھی ہو جاتا ہے کیونکہ "دیوانہ رہنے" کو تو بیشک "عالمِ جوشِ جنوں میں روا کیا معنی لازمی کہہ سکتے ہیں۔ مگر "دیوانہ نہ رہنا" کیونکر "روا" ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی ترمیم سے کیا فائدہ جس کے بعد بھی اعتراض موجود رہے۔

نیاز صاحب نے ایک اور تجویز یہ پیش کر دی ہے کہ "اگر دوسرا مصرع بدستور رکھا جائے تو پہلے مصرع میں لفظ "جنوں" نہ ہونا چاہیئے۔ یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا ع ——— عالمِ جوشِ محبت میں سبھی کچھ ہے روا، ———

— مگر جیسا میں نے اوپر کہا اس شعر پر رائے ظاہر کرنے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے، یہ سارا مفہوم ہی غلط ہے اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے

پہلے مصرع کو شاعر کی موجودہ کیفیات کا حامل سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ موجودہ کیفیات کا حامل دوسرا مصرع ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر کا محبوب سے یہ سوال کرنا کہ "دیوانہ بنوں یا نہ بنوں" خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ابھی عالمِ ہوش میں ہے۔ ہاں وہ محبوب سے دیوانہ بننے یا نہ بننے کی اجازت طلب کرتے وقت اسے آگاہ کر دینا چاہتا ہے کہ "عالمِ جوشِ جنوں" میں ہر چیز روا ہو جاتی ہے۔ اس لئے دیوانہ بننے یا نہ بننے کی اجازت دینے سے قبل محبوب اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اگر اس کے حکم سے دیوانہ بننے کے بعد شاعر نے جراَتِ رندانہ وغیرہ سے کام لیا یا اس سے اور کسی قسم کی کوتاہی یا گستاخی سرزد ہوئی جیسی غالب سے ہوئی تھی۔ ع

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن!

تو محبوب کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے۔

یہ مطلب اتنا صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہیں۔ نہ اسے سمجھنے کے بعد شعر میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

رہا یہ امر کہ "عالم" کا لفظ بے ضرورت ہے مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ "عالم" کا لفظ کسی کیفیت کا انتہائی اور آخری درجہ ظاہر کرتا ہے جس پر پہونچکر روز و شب اور اٹھتے بیٹھتے انسان پر ایک ہی کیفیت طاری رہتی ہے۔ محض "جوشِ جنوں" سے ایک وقتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے جو عین ممکن ہے بعد میں جاتی بھی رہے۔ جنون کی کیفیت میں

(Lucid intervals) بھی ہو سکتے اور ہوتے ہیں۔
اس لئے "عالمِ جوشِ جنوں" کہا گیا جس سے جنون کا آخری اور انتہائی درجہ مسلم ہو گیا، بلکہ اس کی ہمہ گیری اور ہمہ وقتی ثابت ہو گئی۔

(ماہِ نو۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء)

چند متفرق تبصرے

آہنگ اسرار الحق صاحب مجازؔ اُردو کے ہونہار شعرا میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں نوجوانی کا جوش اور تخیل کا بانکپن پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ندرت اور رنگینی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان کے موجودہ رنگ سخن سے ان کے مستقبل کے متعلق خوش گوار پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ اس مختصر سے مجموعہ میں زیادہ تر ان کی نظمیں ہیں۔ آخر میں یا متن کے نیچے چند ایک غزلیں بھی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھی غزلوں کی شان پائی جاتی ہے اور ہم انہیں غزل کا شاعر مانتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار سے ان کے رنگ طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں　　یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ!　　تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی　　بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی!

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا　　　سہرے میں چمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سے رخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی　　　ہو تجھ کو مبارک یہ تری نورجہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ　　　مہکیں تری عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ!

مجموعہ کی ابتدا میں "زیب داستاں" کے عنوان سے جناب سجاد ظہیر صاحب نے مجاز کا تعارف کرایا ہے۔ آپ کے خیال میں "جو شخص ان نظموں اور غزلوں کو پڑھے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ۔۔۔ ۔۔تہذیب و تمدن کی دلہن کا لباس اب ریشمی نہیں، وہ چھیتڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ قصر امرا کی آرام دہ غلامی سے پیچھا چھڑا کر سیلاب حیات کے منجدھار میں پڑنا زیادہ پسند کرنے لگی ہے" مگر اس مجموعہ میں بہت سی نظمیں اس کلیہ کے خلاف پیش کی جاسکتی ہیں اس لئے مجاز کی شاعری کے متعلق یہ حکم لگانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں ادب اور زندگی کے تعلق پر زور دے کر ہمارے شعرا کو ملک کی موجودہ سماجی اور سیاسی جدوجہد سے متاثر ہو کر ادب میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر جو توجہ دلائی گئی ہے ہمیں اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ مگر یہ مسئلہ ہمارے نوجوان شعرا نے غالباً ٹھیک نہیں سمجھا ہے۔ ادب میں انقلاب کے معنی ادب میں انتشار، بدنظمی اور سوقیانہ پن پیدا کرنے اور رخش ادب کو بے لگام چھوڑ دینے کے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے ادب میں جو رسمی اور نام نہاد انقلابی شاعری شروع ہوئی

ہے وہ بے اثر بلکہ مضر ثابت ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا مخالفت اور مقابلہ کی اسپرٹ کو ترک کر کے تخریبی سے زیادہ تعمیری نقطۂ نظر سے کام لیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کے عنوانات پر رسمی نظمیں لکھنے یا ایک کو برا اور دوسرے کو بھلا کہنے کی بجائے زندگی اور سماج کے مسائل میں زیادہ گہری اور سنجیدہ نظر ڈالیں اور زندگی میں ان انسانی اوصاف اور خصائل کو راہ دینے کا پرچار کریں جنھوں نے ہر زمانے میں قومی زندگی کی تعمیر اور ترقی میں بیش از بیش حصہ لیا ہے۔

جام طہور

اثر صہبائی صاحب پنجاب کے جدید شعرا میں رباعیاں لکھنے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی رباعیوں کا ایک مختصر مجموعہ "راحت کدہ" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے مگر اس مجموعہ میں آپ کی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد کے دور زندگی کی رباعیاں تھیں۔ زیر نظر مجموعہ میں آپ کی کل رباعیاں شامل ہیں جو تعداد میں ۲۶۱ ہیں۔ آخر میں ۲۴ قطعات بھی ہیں۔

رباعی لکھنا حقیقتاً نہایت مشکل فن ہے۔ چند غیر معروف اور متعین بحروں میں لکھنے کی قید کے علاوہ شاعر کو صرف ایک یعنی رباعی کے چوتھے مصرع میں ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت یا اصل مفہوم پیش کرنا ہوتا ہے۔ باقی تین مصرعے رباعی کو مکمل کرنے کے لئے کہے جاتے ہیں اور یہیں شاعر کے کمال کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر تینوں مصرعے چوتھے مصرعے سے قدرتی طور پر مربوط اور اصل مضمون میں مکمل طریقے سے پیوست نہ ہوں یا ان میں ذرا سا بھی جھول معلوم ہو تو پوری رباعی بے لطف ہو جاتی ہے۔ فارسی میں خیام اور سرمد کی رباعیاں مشہور ہیں اور اردو میں انیس

مولانا حالی اور اکبر الہ آبادی نے رباعی لکھنے میں کمال حاصل کیا تھا۔ جدید ایرانی شاعری کا تو چولا ہی بدل گیا مگر اُردو میں چودھری جگت موہن لال رواںؔ آنجہانی نے بھی خوب خوب رباعیاں لکھی تھیں۔ اُردو کے زندہ شعرا میں حضرت امجد حیدر آبادی چوٹی کی رباعی کہنے والوں میں سے ہیں۔ آثر صہبائی نے بھی رباعی لکھنے میں اچھی مہارت حاصل کی ہے۔

اس مجموعہ کی رباعیاں زبان کی پختگی اور مضامین کی بوقلمونی سے معمور ہیں۔ ان میں حسن و عشق، مجاز و حقیقت، خیر و شر، زندگی و موت، مسرت و غم، انسان و خدا وغیرہ جیسے مسائل پر فلسفہ اور شاعری کا اچھا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ شاعر کے ذاتی غور و فکر اور رجحان کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کے بغیر شعر اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

یہ پھول یہ بادِ سرد یہ آب رواں ‏ ‏ یہ منظر کوہسار و ماہ تاباں
ہر چیز ہے بادۂ سکوں سے مسرور ‏ ‏ انساں ہی اسیر غم ہے نادان انساں!

مٹی میں یہ روشنی کہاں سے آئی؟ ‏ ‏ یہ عقل، یہ آگہی کہاں سے آئی؟
پھر عشق جنوں فزا کی مے میں یا رب ‏ ‏ سرمستی و بےخودی کہاں سے آئی؟

وہ کیف و سرور اب کہاں سے لاؤں! ‏ ‏ وہ عشق کا نور اب کہاں سے لاؤں!
روشن تھی یہ کائنات جس سے ہمدم ‏ ‏ وہ شعلۂ طور اب کہاں سے لاؤں!

یہ بود و نبود کیا ہے، معلوم نہیں　　　یہ آتش و دود کیا ہے، معلوم نہیں
ہستی میں عدم ہے اور عدم میں ہستی　　　یہ مرگ و وجود کیا ہے، معلوم نہیں

ہر بت میں جھلک خدا کی پائی ہم نے　　　نادان تھے، خوب منھ کی کھائی ہم نے
ایک ایک صنم کو ہم نے توڑا آخر　　　پھر پا کے خدا کو، کی خدائی ہم نے

شیطان تھا سر بہ سجدہ یزداں کے حضور　　　لیکن نہ کبھی جھکا وہ انساں کے حضور
انساں ہے مگر کہ ہے خدا سے سرکش　　　لیکن ہے نیاز مند شیطاں کے حضور

اے کیف و سرور زندگانی آجا　　　اے روح نشاط و شادمانی آجا
ہر شے ہے ترے بغیر آنی جانی　　　تو بن کے حیات جاودانی آجا!

مگر بعض جگہ خیال یا طرز بیان مستعار معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ رباعی

کچھ حق سے جدا نہیں ہیں مردانِ خدا　　　مجبور فنا نہیں ہیں مردانِ خدا
لاریب خدا کے دست و بازو ہیں یہی　　　ہر چند خدا نہیں ہیں مردانِ خدا

خیال کے کچھ اضافہ کے ساتھ فارسی کے اس مشہور شعر کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے ؎

مردان خدا خدا نباشند　　　لیکن ز خدا جدا نباشند

یا حسب ذیل مصرعے

تو حلقۂ صبح و شام سے ہے آزاد

اور

مانند سحر مری جوانی ہوتی

اقبالؔ کے ان دو مصرعوں کی تبدیل شدہ صورت ہیں

حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے

اور

بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

یا ایک رباعی کے یہ دو مصرعے

جب تجھ سے جدا نہ تھے تو تھے ہم بھی خدا   ہم تجھ سے جدا ہوئے تو انسان ہوئے

غالبؔ کے مشہور شعر ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

کے ناکام چربے ہیں۔

مجموعہ کی ابتدا میں آثرؔ صاحب نے تفصیل کے ساتھ ان شعرا و مفکرین کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے جن کے خیالات سے آپ کا ذوق شاعری متاثر ہوا ہے۔ ان میں غالبؔ اور اقبالؔ کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے مندرجہ بالا تسامحات ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ ضرورت سے زائد عقیدت رکھنے کا نتیجہ ہوں۔

درسِ غالبؔ

اہلِ پنجاب کو جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ "ایجاد بندہ" کے مصداق ہو۔ مگر علم و ادب کا ذوق کسی کی میراث نہیں، نہ اس کی اچھائی یا برائی کو دو اور دو چار

کے قطعی اور دو ٹوک قسم کے اصولوں کے مطابق جانچ سکتے ہیں۔ یہاں تو ——
"تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کا فیضان درکا ہے۔ اس لئے یہ بالکل ممکن ہے
کہ جو چیز ایک شخص کو ناپسند ہو دوسرے کے نزدیک وہ بہترین قرار پائے۔

بہرحال اس مجموعہ میں جدت سے ضرور کام لیا گیا ہے۔ اور وہ جدت یہ
ہے کہ مروجہ و متداول دیوان غالبؔ کو ردیف دار حروف تہجی کے اعتبار سے
ترتیب دیا گیا ہے۔ مثلاً ہونا کی ردیف کا سارا کلام ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے،
نہ ہوا کا ایک جگہ اور اسی طرح اور۔ اس ترتیب میں غزل، قصیدہ، مثنوی،
رباعی، قطعہ وغیرہ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، سب کو ایک لاٹھی
سے ہانکا گیا ہے مثلاً ہوئے کے ردیف میں کم ہوئے، دم ہوئے کی غزل کے
بعد ہی مسہل والا قطعہ ہے۔ "یہ سب کے دن ہوئے؟" اس کے بعد
"چراغاں کئے ہوئے" "مژگاں کئے ہوئے" والی غزل۔ وغیرہ۔

اس جدت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بقول مرتب صاحب
"اردو کی خوش قسمتی سے کلام غالب کی قدر و منزلت دن بدن زیادہ ہوتی
جاتی ہے خصوصاً اردو اشعار کو ضرب المثل یا سند کے طور پر استعمال کیے جانے
کا میلان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے مگر افسوس کسی حوالہ یا سند کی تلاش میں
چونکہ تمام دیوان غالبؔ کو مکمل پڑھنا ممکن نہیں ہے اور موجودہ گڈ مڈ ترتیب
غزلیات سے متفرق اشعار کا بہ آسانی پتہ چلانا اس سے بھی مشکل کام ہے"
اس لئے اس دقت کو اس نئی ترتیب کے ذریعے دور کر دیا گیا ہے جس سے
"ایک بڑی حد تک یہ آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ غزلیات وغیرہ کو صرف ردیف

دار ڈھونڈنے سے ایک دو منٹ میں ہر غزل اور شعر کا پتہ لگایا جا سکتا ہے"
گویا یہ مجموعہ غالب کے کلام کا انڈکس ہے۔

اس ترتیب کے سلسلے میں" یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ مرزا غالب کے مشہور مطلع " نہ تھا کچھ تو خدا تھا " کی غزل کا نمبر خود بخود آغاز کلام میں سب سے پہلے آگیا۔ مرزا غالب مسلک وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس لئے ان کے کلام کا ایسا حسب حال برجستہ افتتاح بجائے خود ایک دلچسپ نکتہ ہے" کتاب کی بعض اور خوبیاں صرف دیکھنے پر معلوم ہو سکتی ہیں۔

اقبال اور اس کا پیغام

" سرود رفتہ شاید واپس آئے یا نہ آئے پھر بھی ہم ان محدود ذرائع سے جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں اس کی صدائے باز گشت پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تصنیف صدائے باز گشت کے سوا اور کچھ نہیں"

مندرجہ بالا اقتباس جو زیر نظر تصنیف کے " تعارف " سے ماخوذ ہے اس کتاب کی اشاعت کے مقصد کے اظہار کا ایک اچھا پیرایہ ہے جس سے اقبال کے کلام کے ساتھ صاحب مضمون کی خوش عقیدگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ مقالہ اصل میں انگریزی زبان میں تھا جسے ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے علامہ اقبال کی تشریف آوری کے موقع پر اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن میں پڑھا تھا۔ اب رفیق خاور صاحب نے جو ڈاکٹر موصوف کے چھوٹے بھائی ہیں اسے اردو زبان میں منتقل کیا ہے اور اس میں بعض جگہ ترمیم بھی کی ہے۔ نیز ذاتی آرا کے اظہار

کے لئے آخری حصہ اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ اس مقالہ میں اقبالؔ کی شاعری پر ان شگفتہ الفاظ میں رائے زنی کی گئی ہے: "اقبالؔ کا سرچشمۂ الہام مسرت ہے۔ یہی ان کی زندگی اور یہی ان کی روح رواں ہے۔ ان کی شاعری میں ہم شادمانی ہی شادمانی جلوہ گر پاتے ہیں۔ اس شادمانی کے مظاہر بے شمار ہیں: قدرت کی شادمانی، علم و حکمت کی شادمانی، انسانیت کی شادمانی، ذوق عمل کی شادمانی، امید اور ایقان کی شادمانی، طاقت اور توانائی کی شادمانی، حُسن کی شادمانی، محبت کی شادمانی، کیف، رنگ، نور اور نکہت کی شادمانی۔ شروع سے کر آخر تک آپ کی شاعری کا آب و رنگ مسرت ہے۔ آپ کے تمام مزرع سخن میں مسرت ہی مسرت لہلہاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

بہ حیثیت مجموعی اس کتاب میں علامہ اقبالؔ کی شاعری پر نہ صرف والہانہ انداز میں بلکہ نہایت قابلیت کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے اور ان عناصر سے بحث کی گئی ہے جو اقبالؔ کو عہد حاضر کا بہترین فلسفی شاعر اور اس کی شاعری کو تسخیر حیات کا ایک کامیاب آلۂ کار قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کے مذہبی اور وطنی ماحول نیز ان کی ذاتی تعلیم اور عام مطالعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا فلسفہ مشرق کے فلسفۂ ویدانت اور تصوف اور مغرب کی انسانیت اور ذوقِ عمل سے مل کر بنا ہے۔ ڈاکٹر خالد کے الفاظ میں "اقبالؔ کی ذہنیت مشرقی مذہب پرستی اور مغربی انا پرستی دونوں کا مجموعہ ہے۔"

مولانا عبدالمجید صاحب سالکؔ نے کتاب پر مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں ڈاکٹر خالد کے اس خیال سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ آپ کے خیال میں اقبالؔ

کی شاعری تعلیمات قرآنی کی تفسیر ہی اور اس کی پختگی اور رسائی کا راز محض اقبال کی قوت ایمان ہی۔ ہمارے خیال میں کسی بڑے شاعر کی تنقید کا یہ طریقہ صحیح نہیں کیونکہ ہر بڑا شاعر ایک خاص مذہب یا قوم کا نمایندہ ہونے کے باوجود ایک عالم گیر نصب العین کی ترجمانی کرتا ہی اس لئے اسے صرف مذہب کی کسوٹی پر پرکھنا اس کے ساتھ ناانصافی کرنا ہی۔ اقبال ایسے ہی شاعروں میں سے ہی کیونکہ وہ انسانیت کا ترجمان اور حیات کا مفسر ہے اور اس کی شاعری ایک بین الاقوامی میراث ہے۔ اس کی شاعری پر تنقید بین الاقوامی نقطۂ نظر سے ہونی چاہیئے۔

تحفۂ لبسنت منشی تلوک چند محروم کا شمار اُردو کے پُرانے اور مشاق شاعروں میں ہی۔ اس مجموعہ میں لبسنت رت کے متعلق آپ کی لکھی ہوئی بارہ نظمیں شامل ہیں اور سب کی سب اچھی ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض نظموں میں لبسنت کے سلسلے میں قومی اور وطنی راگ چھیڑا گیا ہے اور نوجوانوں کو عمل اور حرکت کی تعلیم دی گئی ہی۔ لبسنت ہمارے دیس کا خاص موسم اور تہوار ہے اس لئے اس موقع پر وطن کی محبت کا ترانہ گانا نہایت برمحل ہے۔

(سہ ماہی اُردو دہلی اپریل ۱۹۳۹ء)

باغ دلکش یہ دلچسپ مجموعہ ہے جناب سید مسعود حسن صاحب مسعود (علیگ) سابق ڈپٹی کلکٹر یو پی کے کلام کا جو چھوٹے سائز کے ۱۸۹ صفحات پر مشتمل ہی۔ اس میں مسعود صاحب کی غزلیں۔ قصیدے۔

نظمیں اور قطعے شامل ہیں اور آخر میں چند صفحات ان قطعات تاریخ کے لئے وقف کیئے گئے ہیں جو آپ کے احباب اور اردو کے بعض مشہور شعرا نے باغ دل کش کی طباعت کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ کتاب میں "معلومات شاعری" کے عنوان سے ایک باب بھی ہے جس میں اُن غزل گو شعرا کے افادہ کے خیال سے جو فن شاعری سے ناواقف ہوتے ہیں عروض وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

ابتدا میں مسعود صاحب نے اپنی شاعری کے متعلق بعض غلط فہمیاں رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور چند بے لاگ باتیں کہیں ہیں جن سے ناظرین کو آپ کا کلام پرکھنے میں مدد ملے گی بلکہ شاعر کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی بھی نہ پیدا ہوگی۔ پھر "تعارف" "مقدمہ" اور "تبصرہ" کے عنوانات سے چند تقریظیں ہیں۔ اس کے بعد کلام شروع ہوتا ہے۔

بقول مولوی عبدالباری آسی مسعود صاحب کا موجودہ شعرا کے اس طبقہ میں شمار ہونا چاہیئے جو "ہرگز اپنے تخیل شاعرانہ کو گمراہی کی نذر کرنے کے واسطے آمادہ نہیں ہے۔ جو نہ ان چنے ہوئے دو ڈھائی سو الفاظ کو بار بار دہرانا پسند کرتا ہے جنہیں اس دور کے مشہور باکمالوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے نہ ہر وقت فطرت اور قدرت پر کافرماجرائی کی چوٹیں کرتا ہے جو نہ توالی اضافات اور غرابت الفاظ سے مرعوب ہوتا ہے نہ معنی آفرینی کو خیرباد کہہ کر آزادانہ اپنے رنگین مگر بے معنی سرمست نغموں سے ایک ملت کو الحاد کا پیغام دیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو شوخی اور ادائے بیان میں داغ کو کبھی نہیں بھولتا جو منطق استدلال اور ندرت خیال میں غالب کو کبھی نظرانداز

نہیں کرتا، جو ذوقؔ کے محاورات کو کبھی نہیں ٹھکراتا، جو ناسخؔ کی پختہ مشقی اور آتشؔ کی آزادانہ روی کا ہمیشہ اتباع کرتا ہے، جو میرؔ کی برشتگی اور جذبات نگاری کو اپنا رہبر اولین تسلیم کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے انسان بن کر انسانوں کے سننے اور سمجھنے کے ارادہ سے کہتا ہے اور پھر مزا یہ کہ وہ شاعری کے رنگ انقلابی سے بھی غافل نہیں ہوتا۔ ضرورت کے مطابق اس کے یہاں جدید ترکیبیں، نئے اسلوب بیان اور حال کے تراشے ہوئے الفاظ بھی ملتے ہیں۔"

بلاشبہ مندرجۂ بالا اقتباس مسعود صاحب کی شاعری کے عام رنگ پر مختصر مگر نہایت جامع تبصرہ ہے۔ مسعود صاحب کا خاص وصف ان کی اعتدال پسندی ہے۔ اگرچہ آپ افضلؔ لکھنوی (تلمیذ حضرت آسیرؔ لکھنوی) کے شاگرد اور لکھنؤ اسکول کے شاعر ہیں مگر موجودہ زمانہ کے مذاق سے متاثر ہو کر آپ نے اپنی غزلوں میں جدت اور ندرت سے کام لیا ہے اور یہ جدت نہ صرف اسلوب بیان میں بلکہ غزل کے داخلی رنگ یعنی مضامین اور خیالات میں بھی موجود ہے۔

اوّل درجہ کا شاعر ہونا ہر شخص کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں یہ امتیاز صرف دو بزرگوں کے لئے مخصوص تھا، اقبالؔ اور اصغرؔ۔ یہ دونوں آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے نام لیوا بلکہ متبعین باقی ہیں اور یہ اُردو شاعری کے لئے فال نیک ہے کیونکہ ایک اچھے شاعر کے لئے ہر حال میں اپنا نصب العین بلند رکھنا ضروری ہے۔ ایک غزل گو کے لئے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ غزل کے سلسلہ میں جو زیادہ تر عشقیہ شاعری کیلئے مخصوص ہے اگر شاعر کے سامنے بلند نصب العین نہ ہو تو ہر ہر قدم پر گمراہی کا اندیشہ

رہتا ہے۔ عشق اور ہوس کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں اور پست جذبات سے مغلوب ہو جانا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لئے اگر نصب العین بلند نہ ہو تو شاعر رکیک جذبات سے کھیلنے لگتا ہے اور لطیف اور پاکیزہ جذبات کی بجائے بازاری اور اوچھے خیالات نظم ہو جاتے ہیں۔ مسعود صاحب نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا نصب العین بلند رکھا ہے اور اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے لطیف اور پاکیزہ جذبات کی نہایت دل کش پیرایہ میں ترجمانی کی ہے۔

ذیل میں آپ کی غزلوں کا مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے آپ کی شاعری کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی ؎

کامیاب وفا نہیں ملتے | یوں تو ملتے ہیں کامیاب بہت
عیش دنیا سے خوش نہ ہو کوئی | ہم نے دیکھے ہیں ایسے خواب بہت
زد میں امواج کی وہ آتے ہیں | سر اٹھاتے ہیں جو حباب بہت

اس کو تسبیح اسے زنّار کی حرص | دیکھئے کافر و دیندار کی حرص
میکدہ کی نہیں خیر اے ساقی | گر یہی ہے ترے میخوار کی حرص
آنکھ چہرے سے نہیں ہٹتی ہے | دیکھئے طالب دیدار کی حرص

دل کے کھونے کے ہیں ہزار طریق | جان جانے کے ہیں ہزار طریق
طرز جور و ستم نہیں نہ سہی | دل دکھانے کے ہیں ہزار طریق

لغزشِ پا اگر سلامت ہے
چوٹ کھانے کے ہیں ہزار طریق
ساتھ چھوڑے اگر نہ قوتِ ضبط
غم اٹھانے کے ہیں ہزار طریق

نظر میں ان کے نہیں جو وقار کے قابل
وہ عاشقوں میں کہاں، ہیں شمار کے قابل
فلک نے طوقِ غلامی انہیں کو پہنائے
جو گردنیں تھیں زمانے میں ہار کے قابل
فقط یہ جذبۂ توفیق کی عنایت ہے
کہاں تھے حضرت منصور دار کے قابل

اب یہ عالم ہے جو دل میں مرے ارماں نہ رہے
روح قالب میں گھڑی بھر کو بھی مہماں نہ رہے
بخیہ گر کی یہ تمنا کہ گریباں ہو درست
دستِ وحشت کا تقاضا ہے کہ داماں نہ رہے
یاس آئینۂ شفاف بنا دے اس کو
اب مرے دل میں کوئی حسرت و ارماں نہ رہے

آج اس انداز سے ان کو سنایا حالِ زار
وہ بھی پہروں تک مرا حسنِ بیاں دیکھا کیے

چین ملتا نہیں گھر میں بھی، قیامت کیا ہے
اٹھ کے سو بار میں بیٹھا ہوں، یہ وحشت کیا ہے

آپ کیا جانیں گزرتی ہے جو اس پر شب و روز
آپ کیا جانیں کہ دل کی مرے حالت کیا ہے
شومیٔ بخت کی مسعود ہو کیا فکر مجھے
شکر ہر حال میں لازم ہے شکایت کیا ہے!

مندرجۂ بالا اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسعود صاحب غزل کی شاعری میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ تفصیلی مطالعہ کے لئے ناظرین کو رونق علی صاحب مختار۔ لکھیم پور۔ ضلع کھیری (یو۔پی) سے اصل کتاب طلب کرنی چاہئے۔

جلیل قدوائی کی دو اور تصانیف

انتخاب حسرت | بادشاہ غزل مولانا حسرت موہانی مرحوم کا انتخاب قدوائی صاحب نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں شائع کرایا تھا۔ اب ہماری درخواست پر قدوائی صاحب نے یہ سیر حاصل انتخاب از سر نو مرتب کیا ہے۔

سابقہ انتخاب میں مولانا کا ۱۹۳۴ء تک کا کلام پیش نظر رہا تھا۔ موجودہ انتخاب میں ۱۸۹۴ء سے ۱۹۵۰ء تک کے کلام یعنی مولانا کی پوری چھپن (۵۶) برس کی شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے ـــ قدوائی صاحب نے موجودہ انتخاب میں بالکل نیا مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں مولانا کی حریت پروری۔ سیاست۔ شاعری۔ سخن سنجی نیز ان کی شخصیت و سیرت پر نہایت دلچسپ تبصرہ کر کے تنقید و سیرت نگاری کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں۔

خوبصورت کتابت۔ حسین طباعت۔ نفیس جلد مع رنگین گردپوش $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز۔ ۲۳۲ صفحات۔ قیمت، دو روپیہ آٹھ آنہ۔

تنقیدیں اور خاکے | تنقید میں افسانے کی شان پیدا کرنا یہ طرز خاص قدوائی صاحب کی ایجاد ہے۔ اپنے ہیرو کی ادبی و شاعرانہ حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ ایک جیتے جاگتے انداز میں اس کی شخصیت، سیرت اور زندگی کے قلمی مرقعے بھی کھینچ دیتے ہیں۔

اس کتاب میں جدید غزل گو شعراء حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ عزیز۔ اثر۔ نیز قومی شعراء حالی۔ اکبر۔ اور اقبال پر قدوائی صاحب کے مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ بیحد دلچسپ و معلومات افزا مجموعہ۔ جس میں شعراء کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

خوبصورت کتابت۔ دیدہ زیب طباعت۔ نفیس جلد مع رنگین گردپوش۔
$\frac{20 \times 30}{16}$ سائز۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت، تین روپے

ناشران:- اُردو اکیڈمی، بنس روڈ، کراچی
اُردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور

انتخاب شعرائے بدنام

از

جلیل قدوائی

اردو میں بدنام شعرا کی ایک مستقل روایت چلی آ رہی ہے ایک استاد نے کسی کی شاعری کی نسبت "چوما چاٹی" کا لفظ استعمال کر دیا۔ کسی اور نے ایک بڑے استاد کے بارے میں کہہ دیا کہ ان کی شاعری کو کسی نواب کی "مصاحبت نے ڈبویا" بس وہ گھڑی ہے اور آج کا دن۔ کوئی ان کا کلام پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

یہ کتاب ایسے ہی پانچ بدنام شعرا کے کلام کا سیر حاصل انتخاب ہے۔ ان شعرا کے کلام اردو کے بڑے غزل گو شعرا کے کلام سے ٹکر لے سکتا ہے۔

ابتدائے کتاب میں جناب جلیل قدوائی نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں غزل کی شاعری پر اصولی بحث کر کے ان "بدنام شعراء" کے کلام کا اردو غزل کے بعض چوٹی کے شعرا سے موازنہ بھی کیا ہے۔

کتاب بے حد دلچسپ، معلومات افزا بلکہ انقلاب آفریں۔

طباعت و کتابت عمدہ' مجلد' گرد پوش

قیمت تین روپے بارہ آنے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی